آئینۂ تاریخ

حصّہ اوّل

مرتبہ

افضل حسین ایم ۔ اے ۔ ایل ۔ ٹی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

تاریخ دراصل انسانیت کا حافظہ ہے، جو نہ صرف قوموں اور جماعتوں کے بلکہ کل نوعِ انسانی کے پچھلے تجربات کا دفتر محفوظ رکھ کر انسان کے سامنے پیش کرتا ہے، تاکہ ان تجربات کی روشنی میں انسان اپنے حال کا جائزہ لے اور اپنے مستقبل کو آزمودہ بھلائیوں سے درست اور آزمودہ برائیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔ اس دفتر میں مختلف نمائندہ شخصیتوں، اداروں قوموں اور جماعتوں کے کارنامے ایک مربوط اور مسلسل طرزِ عمل کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں، جنہیں دیکھ کر ہم ان کے نفسیات، ان کی افتادِ مزاج اور ان کی طینت کو سمجھ سکتے ہیں، تاکہ آئندہ ان کے ساتھ ہم ایک اجنبی کی طرح نہیں، بلکہ ایک واقف کار کی طرح معاملہ کر سکیں۔

یہ دفتر اجتماعی زندگی کے مدارج کے اعتبار سے بہت زیادہ مگر نوعیت کے لحاظ سے وہی اہمیت رکھتا ہے جو فردِ واحد کی زندگی میں اس کے حافظے کو حاصل ہے۔ اگر ایک فردِ واحد کا حافظہ اس سے سلب کر لیا جائے، تو وہ پے درپے غلطیاں کرے گا یہاں تک کہ اپنی غلطیوں کا خود شکار ہو کر رہ جائے گا۔ اگر کسی شخص کی گذشتہ زندگی کا ریکارڈ ہمارے سامنے نہ ہو، تو ہم اس کے متعلق صحیح رائے نہ قائم کر سکیں گے اور نہ اس کے متعلق اپنے طرزِ عمل کا صحیح فیصلہ کر سکیں گے۔ بالکل یہی صورت جماعتی زندگی کی بھی ہے کہ اگر ہم نوعِ انسانی کے، اور خود اپنے اور ان قوموں اور اداروں کے جن سے ہمیں سابقہ پیش آتا ہے، پچھلے ریکارڈ سے واقف نہ ہوں تو ہماری اجتماعی زندگی غلط کاریوں اور غلط اندیشیوں کا مجموعہ بن کر رہ جائے گی۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس دفترِ پارینہ کے اوراق کا کبھی کبھی نہیں بلکہ بار بار جائزہ لیتے رہیں۔

لیکن تاریخ کے اس دفتر کا جائزہ لینے کے لیے تین نقطۂ نظر ممکن ہیں۔ ایک نقطۂ نظر محض معروضی مطالعہ کا ہے۔ یعنی واقعات اور حالات جیسے کچھ گزرے ہیں، ان کو جوں کا توں

دیکھا جائے۔ دوسرا نقطۂ نظر قوم پرستانہ مطالعہ کا ہے یعنی ہم واقعات کو اس نسل یا اس قوم، یا اس ملک کی حمایت کے جذبے سے دیکھیں جس سے ہمارا تعلق ہے، اسی لحاظ سے نتائج اخذ کریں، اور اسی لحاظ سے اشخاص اور اقوام کے متعلق رائے قائم کریں۔ تیسرا نقطۂ نظر مقصدی اور اصولی ہے یعنی ہم نسلی و قومی تعصبات سے بالاتر ہو کر مجرد انسانی فلاح وسعادت کو مقصود ٹھہرا کر اور نیک و بد کا ایک بے لاگ معیار سامنے رکھ کر نسلِ انسانی اور اس کے مختلف اجزا کے کارناموں کو جانچیں، اور بے لاگ ہی رائے قائم کریں۔ ان میں سے پہلا نقطۂ نظر خالص مورّخانہ ہے، اور اس حیثیت سے مفید ہے کہ اس طرح کے مطالعہ سے صحیح واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں، مگر بجائے خود مفید نہیں ہے۔ دوسرے نقطۂ نظر میں بڑی جاذبیت ہے۔ بلا مبالغہ تاریخ کے ۹۸ فی صدی طالب علموں کو اس نقطۂ نظر کی جاذبیت اپنی طرف کھینچ لیتی ہے کیونکہ ہر طالب علم بہرحال کسی نہ کسی نسل یا قوم یا ملک سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کی خود غرضی وسعت اختیار کرکے بآسانی شخصی خود غرضی سے قومی خود غرضی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ اپنے اور اپنی قوم کے نقطۂ نظر سے تاریخ کا مطالعہ کرنے پر مائل ہوتا ہے اس میں اسے فخر و ناز کے لیے چند بت مل جاتے ہیں جن کی پرستش کا نشہ اُسے اور اس کی قوم کو اُبھرنے میں مدد دیتا ہے اور اسی میں اس کو نفرت اور عداوت کے لیے چند ہدف بھی مل جاتے ہیں، جن پر اپنے جذباتِ غضب کو مرکوز کرکے وہ قومی وحدت، مقابلہ و مسابقت اور کامیابی و برتری کے مقاصد حاصل کرتا ہے۔ لیکن دنیا میں اکثر جھوٹ اسی مطالعہ کی بنا پر پھیلے ہیں۔ اکثر ظلم، اکثر بے انصافیاں، اکثر خوں ریزیاں اور قومی و نسلی عداوتیں اسی کی بدولت برپا ہوئی ہیں۔ اکثر بروں کو اچھا، اکثر شیطانوں کو مرکز پرستش اسی مطالعہ نے بنایا ہے۔ اکثر اچھوں کو بُرا اور اکثر نیکو کاروں کو لعن طعن کا ہدف اسی مطالعہ کی بدولت ٹھہرایا گیا ہے۔ انسانیت کو مجروح کرنے اور زمین کو فساد سے بھرنے میں تاریخ کے اس طرز مطالعہ کا کچھ کم حصہ نہیں ہے۔ یہ مرض دنیا بھر میں ترقی کرکے اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ اب قومی اغراض کے لیے تاریخیں گھڑی جاتی ہیں۔ جن قوموں کا ماضی کچھ نہ تھا وہ ایک پورا ماضی اپنی خواہشات کے

مطابق تصنیف کر کے رکھ دیتی ہیں اور جن سے حال میں مقابلہ درپیش ہے، ان کے ماضی کی تصویر کو ل تار سے منقش کر کے تیار کر لی جاتی ہے تا کہ نئی نسلوں میں ان کے خلاف بغض پیدا کیا جا سکے۔ رہا تیسری قسم کا مطالعہ تو وہ یقیناً سب سے بہتر ہے، مگر اس کے صحیح و نتیجہ خیز ہونے کا انحصار دو باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ بجائے خود انسانی فلاح و سعادت کا نظریہ درست اور نیک و بد کا معیار صحیح ہو۔ دوسرے یہ کہ واقعات جن پر استدلال کی عمارت اٹھائی جاتی ہے، معروضی مطالعے کے ذریعے اخذ کیے گئے ہوں نہ کہ اپنے نظریے کو سامنے رکھ کر ان کو ایک خاص سانچے میں ڈھال لیا گیا ہو۔

اسلام چونکہ کسی خاص قومیت کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک مسلک ہے جو مطلقاً انسان اور اس کی سعادت سے تعلق رکھتا ہے اور ان تعصبات سے اس کو کسی قسم کی دلچسپی نہیں ہے جو انسانوں کی نسلی، قومی اور جغرافی تقسیمات سے پیدا ہوتے ہیں لہٰذا تاریخ میں اس نے یہی آخری رویہ اختیار کیا ہے۔ اگر ایک مسلمان صحیح اسلامی ذہنیت کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کرے تو اس کا فرض یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ واقعات کو جیسے وہ فی الواقع گزرے ہیں، بلا کسی تعصب کے جوں کا توں سامنے رکھے اور پھر اسلام نے جو معیار حق و باطل اس کو دیا ہے، اس کے مطابق اشخاص، اقوام اور اداروں کے رویوں کو جانچ کر بے لاگ نتائج اخذ کرے غلطی جہاں بھی ہو، کوتاہی جہاں بھی پائی جائے بے تکلف وہیں انگلی رکھ دینی چاہیے اور کھوج لگانا چاہیے کہ اس کی پیدائش کے اسباب کیا ہیں اور اس نے انسانی فلاح و سعادت پر کیا اثر ڈالا ہے، کتنا اور کس طرح۔ اسی طرح خوبی جہاں جس میں بھی نظر آئے، بے تکلف اس کا ادراک کرنا چاہیے اور اس کے مفید نتائج یا غیر نتیجہ خیز رہ جانے کے اسباب کا سراغ لگانا چاہیے۔ ٹھیک ٹھیک یہی رویہ ہے جو قرآن میں سوانح اشخاص اور تاریخ اقوام سے بحث و استدلال کرتے ہوئے اختیار کیا گیا ہے۔

تاریخ کے باب میں یہ اسلام کا مسلک ہے اور مسلمان کا بھی یہی مسلک ہونا چاہیے۔"

ایک مبصر کا تاریخ پر مندرجہ بالا تبصرہ آئینۂ تاریخ کے لیے موزوں دیباچہ ہے۔

(افضل حسین) یکم ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ

آئینۂ تاریخ حصہ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب ۱

ہمارا ملک اور اس کے قدیم باشندے

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اپنی سلطنت کے ایک ایسے حصّے میں آباد کیا ہے جو نہایت زرخیز اور سرسبز و شاداب ہے۔ یوں تو وہ رحمٰن و رحیم ہے اور ساری دنیا اس کے احسانات کے نیچے دبی ہوئی ہے مگر ہمارے ملک پر تو اسکی خاص عنایات ہیں۔ خوب پانی برساتا اور طرح طرح کا غلّہ اگاتا ہے مختلف قسم کے پیڑ پودوں اور جانور پیدا کیے ہیں، زمین کو معدنی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ غرض ہمارے کھانے پینے پہننے اوڑھنے اور آرام سے زندگی گزارنے کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، اللہ نے اُن سب کا انتظام بڑے پیمانہ پر کیا ہے۔ چنانچہ ہمارے کروڑوں بھائی بند یہاں رہتے اور اللہ کی دی ہوئی ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس وقت ہمارے ملک میں ۶۳ کروڑ سے بھی زیادہ انسان بستے ہیں لیکن یہ سب ایک سے نہیں ہیں۔ ان کی شکل صورت، لباس، غذا، رہن سہن، بول چال، عقیدے وغیرہ میں کافی فرق ہے۔ ان میں کالے اور سانولے بھی ہیں، گورے اور

گندمی بھی، اونچے ڈیل ڈول کے بھی ہیں، ٹھگنے اور پستہ قد بھی۔ دھوتی پاجامہ یا کوٹ پتلون پہننے والے بھی پائے جاتے ہیں اور برہنہ یا نیم برہنہ پھرنے والے بھی۔ ہندو، مسلمان، سکھ بھی ہیں اور عیسائی، بودھ اور پارسی بھی۔ کوئی اردو بولتا ہے کوئی ہندی کوئی بنگالی بولتا ہے، کوئی پنجابی۔ ایک ہی ملک کے اندر باشندوں میں اتنا اختلاف کیوں ہے؟ اس کے دراصل دو بڑے سبب ہیں:۔

۱۔ یہ کہ ہمارا ملک بہت وسیع ہے۔ مختلف حصّوں کی آب و ہوا زمین وغیرہ یکساں نہیں ہیں۔ ظاہر ہے ان چیزوں کا اثر لوگوں کے رنگ روپ، لباس، غذا اور رہن سہن وغیرہ پر بہت گہرا پڑتا ہے۔

۲۔ تمام لوگ یہاں کے اصل باشندوں کی اولاد نہیں ہیں، بلکہ مختلف اوقات میں دنیا کے مختلف حصّوں سے جو متعدد قومیں یہاں آ کر آباد ہوئیں، اور جن کا رہن سہن، بول چال، دین دھرم سب جدا تھا ان کی نسلیں بھی پھلی پھولیں اور ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئیں اور گو ان لوگوں نے کچھ اپنے اثرات ڈالے، کچھ دوسروں کے قبول کیے، اور اس طرح اپنی بہت سی خصوصیات کھو دیں، پھر بھی ان میں خاصا فرق اب بھی نظر آتا ہے۔

قدیم باشندے

زمین پر انسان کو آباد ہوئے کتنی مدّت گذری؟ ہمارے ملک میں سب سے پہلے کون لوگ آباد ہوئے؟ ان کا رہن سہن کیسا تھا؟ لوگوں کے عقیدے کیا تھے؟ ان باتوں کے جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ کیونکہ ابتدائی دور کے لوگ مدتوں لکھنے پڑھنے کے فن سے ناواقف رہے اور ہزاروں سال بعد جب کچھ واقفیت ہوئی تو ایسے رسم الخط ایجاد کیے جن کے پڑھنے والے اب نہیں ہیں۔ بعد کے ادوار کی تحریریں پڑھی تو جا سکتی ہیں، مگر مسلمانوں کی آمد سے پہلے تک تاریخ لکھنے کا رواج نہ تھا اور اگر

رہا ہے تو ہمیں اس فن میں اس دور کی کوئی کتاب دستیاب نہیں ہو سکی ہے۔ قصّے کہانیوں کی کتابوں میں بعض واقعات کی طرف اشارے ملتے ہیں مگر وہ جس انداز سے پیش کیے گئے ہیں اس سے خیال گزرتا ہے کہ ان کے مصنّفین واقعات کی صحت کی طرف توجہ دینے کے بجائے ان میں بہت زیادہ نمک مرچ لگا کر پیش کرنے کے عادی تھے۔ اسی لیے قدیم زمانے سے عیسیٰؑ کے تقریبًا ایک ہزار سال بعد تک کی تاریخ مرتب کرنے میں بڑی زحمت پیش آتی ہے۔ بہرحال کھدائیوں کے بعد زمین کی تہوں سے جو چیزیں برآمد ہوئی ہیں، اور قدیم مذہبی کتابوں اور قصے کہانیوں وغیرہ سے جو کچھ اندازہ لگایا جا سکا ہے اس پر مبنی قیاسات کو ہم نیچے درج کرتے ہیں۔

بعض لوگوں کا گمان ہے کہ تمام انسانوں کے باپ حضرت آدمؑ لنکا میں اتارے گئے تھے۔ چنانچہ وہاں آپ کے ہی نام پر ایک پہاڑ کا کوہِ آدم نام رکھ دیا گیا ہے۔ لنکا جیسا کہ تم جانتے ہو، ہمارے ملک کے قریب ہی جنوب کی طرف ایک جزیرہ ہے، جسے آبنائے پاک علیحدہ کرتی ہے۔ ایک جگہ ہمارے ملک سے اس جزیرے کا فاصلہ صرف ۲۲ میل ہے، جہاں سمندر بہت اُتھلا ہے اور جگہ جگہ ریت کے ٹیلے ہیں۔ اس حصّے کا نام لوگوں نے آدم کا پل رکھ کر اس کے بارے میں مشہور کر دیا ہے کہ اسی راستے سے بابا آدم ہمارے ملک میں تشریف لائے تھے۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ دنیا میں سب سے پہلے ہمارے ملک میں انسان آباد ہوئے ہوں گے اور پھر یہیں سے دنیا کے دوسرے حصّوں میں پھیلے ہوں گے۔

پتّھر کا زمانہ

واقعہ کچھ بھی ہو، بہرحال یہاں آبادی ہزاروں سال پہلے سے ہے۔ البتہ ابتدا میں لوگوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور ان کا رہن سہن بھی نہایت سادہ تھا۔ لوگ پھل پھلاری پر گزر اوقات کرتے یا جانوروں کا شکار

کر کے پیٹ پالتے تھے۔ پتّوں سے تن ڈھانکتے یا سردیوں میں کھال لپیٹ لیتے۔ درندوں اور جنگلی جانوروں کے ڈر سے درختوں پر بسیرا لیتے یا پہاڑوں کی کھوہ (غار) میں سر چھپاتے۔ غاروں میں رہنے والے غار کے منھ پر برابر آگ جلتی رکھتے۔ اس سے کئی فائدے تھے۔ اوّل تو جنگلی جانور آگ کے خوف سے قریب نہیں آتے تھے، دوسرے سردیوں میں ہاتھ پاؤں سینکنے کا آرام ہوتا، تیسرے اسی آگ پر گوشت بھون لیا کرتے، چوتھے بار بار آگ پیدا کرنے کی زحمت سے بچ جاتے۔ اس زمانے میں دیا سلائی تو تھی نہیں لکڑیاں رگڑ کر یا پتھر کے ٹکڑوں کو آپس میں ٹکرا کر آگ پیدا کرنی پڑتی تھی جس میں بڑی زحمت ہوتی تھی آج کل کی طرح اُس وقت نہ کوٹھیاں تھیں، نہ کارخانے، نہ سڑکیں تھیں، نہ ریلیں، نہ مدرسے، نہ کالج۔ سادہ زندگی تھی، نہ تکلّفات تھے نہ فیشن۔ ان لوگوں کو نہ کھیتی کرنی آتی تھی، نہ جانور پالنا اور نہ ہی ان چیزوں کی کچھ زیادہ ضرورت محسوس ہوتی تھی کیونکہ تعداد بہت تھوڑی تھی۔ ملک کے بیش تر حصّے پر جنگلات پھیلے ہوئے تھے، پھل پھلاری اور شکار افراط سے مل جاتے تھے۔ ہماری طرح دھن جوڑ جوڑ کر رکھنے اور مال جمع کرنے کی حرص نہ تھی۔ آج پیٹ بھرا کل کا اللہ مالک ہے۔

قدیم باشندے دھات کے استعمال سے مدّتوں ناواقف رہے۔ چنانچہ چنانچہ شکار کرنے یا اپنی جان بچانے کے لیے درختوں کی ٹہنیاں، لکڑی کے بھالے، ہڈی یا پتھر کے نوکیلے ہتھیار استعمال کرتے اسی لیے ہم اس دور کو "پتھر کا زمانہ" کہتے ہیں۔ اس دور کے کچھ ہتھیار زمین کی تہوں سے برآمد ہو گئے ہیں۔ ان کی تصویر پشت پر دی جاتی ہے۔

دھات کا زمانہ

رفتہ رفتہ لوگوں کی تعداد بڑھی تنہا شکار اور پھل پھلاری پر گزر اوقات مشکل ہوگئی۔ چنانچہ کچھ لوگ تو جنگلات اور

دھات کے زمانے کے اوزار

پتھر کے زمانے کے بعد کے اوزار

پتھر کے زمانے کے اوزار

پہاڑیوں میں رہ گئے وہاں اب بھی ان کی نسلیں کول، بھیل، سنتھال، گونڈ وغیرہ اپنی ابتدائی حالت میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مگر جن لوگوں میں ذرا سوجھ بوجھ اور اپچ تھی، وہ وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور دوسرے ذرائع سے اللہ کا فضل تلاش کرنے لگے۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ انہوں نے پیٹ پالنے کے لیے جانور سدھائے اور کھیتی باڑی شروع کی۔ ایسا کرنے سے انہیں غذا حاصل کرنے میں بڑی سہولت ہوگئی۔ جانوروں سے دودھ، گوشت، کھال اور اون دستیاب ہونے لگا، اور کھیتوں سے مختلف قسم کا اناج اور پھل کھیتی باڑی کے لیے مناسب زمین اور آب پاشی کے لیے کافی پانی دریاؤں کے قریب بآسانی مل سکتا تھا، اس لیے لوگوں نے دریاؤں کی وادیوں میں اپنے کھیت بنائے اور چونکہ فصلوں کی دیکھ بھال کے لیے کھیتوں کے قریب ہی ٹھہرنا پڑتا تھا اس لیے آہستہ آہستہ دریاؤں کے آس پاس گھر بنا کر رہنا شروع کیا۔ یہی آبادیاں بڑھتے بڑھتے گاؤں، قصبے اور شہر کی شکل اختیار کر گئیں۔ اس مدت میں انسان نے دھاتوں کا استعمال بھی سیکھ لیا تھا اور اب وہ پتھر کے بھدّے سامان کی جگہ دھات کے ہتھیار، برتن اور زیور وغیرہ بنانے لگا تھا اور شکار کرنے، نیز جان بچانے کے لیے تیر کمان بھالے اور گُرز وغیرہ کا استعمال بھی شروع ہو گیا تھا۔ اسی لیے اس دور کو ہم "دھات کا زمانہ" کہتے ہیں۔

ہڑپا اور موہن جو داڑو ہمارے ملک کی قدیم ترین بستیوں کے جو کھنڈرات کھدائی کے بعد برآمد ہوئے ہیں وہ دریائے سندھ کی وادی میں ہڑپّا اور موہن جو داڑو کے مقامات پر ہیں۔ خیال ہے کہ یہ شہر عیسیٰؑ سے تقریباً تین ہزار سال قبل یہاں آباد تھے ان کے کھنڈرات اور

یہاں سے برآمدشدہ اشیاء دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک لوگ مکانات بنانے اور بستیاں بسانے کے فن میں کافی ماہر ہو چکے تھے۔ پختہ اینٹوں کی بڑی بڑی حویلیاں بناتے، جن میں رہنے سہنے کھانے پکانے اور نہانے وغیرہ کے لیے الگ کمرے ہوتے۔ غسل خانوں میں پانی گرم کرنے کے لیے حوض اور صحن میں پختہ کنویں بھی بنائے جاتے تھے۔ بعض حویلیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ چھتیں پاٹ کر کئی منزلہ تعمیر کی گئی تھیں۔ مکانات ایک دوسرے سے ملا کر سیدھی قطاروں میں بنائے جاتے تھے۔ گلی کوچے کشادہ اور ان کے کنارے گندے پانی کی نالیاں ہوتی تھیں۔ ہتھیار، زیورات اور برتنوں وغیرہ کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ سونا، چاندی، تانبہ، سیسہ اور پیتل وغیرہ، غرض لوہے کے علاوہ بیشتر دھاتوں کے استعمال سے بخوبی واقف تھے۔ ان صنعتوں میں اتنی ترقی دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شاید دور دور تک ان کا تجارتی کاروبار بھی پھیلا ہوا تھا۔ یہ لوگ باقاعدہ کھیتی باڑی کرتے، اور گائے، بیل، بھینس، بھیڑ بکری، اونٹ اور ہاتھی پالتے۔ البتہ گھوڑا اور بلی پالنے کا رواج اس وقت نہ تھا۔ باربرداری کے لیے چھوٹی چھوٹی بیل گاڑیاں بھی استعمال ہوتی تھیں جن میں لکڑی کے پہیے لگائے جاتے تھے۔ یہ لوگ روئی کاتنا اور اونی سوتی کپڑے بننا بھی جانتے تھے۔ مٹی کے برتن اور کھلونے بنانے اور انہیں شوخ رنگوں میں رنگنے نیز نقش و نگار کرنے کے فن سے بھی یہ لوگ بخوبی واقف تھے۔ زیور پہننے کا عام رواج تھا۔ مرد عورتیں امیر غریب سب زیور استعمال کرتے، فرق صرف یہ تھا کہ امیر لوگ سونے چاندی ہاتھی دانت کے زیور پہنتے اور غریب لوگ سیپ کے۔ عام طور پر لوگ داڑھیاں چھوڑتے تھے اور مونچھیں کترواتے تھے۔

انہیں مقاماتِ پر نادِ علی (تعویذ) جیسی بہت سی چھوٹی چھوٹی مہریں دستیاب ہوئی

ہیں، جن پر مختلف قسم کے جانوروں یا دیوی دیوتاؤں کی تصاویر بنی ہوئی ہیں، اور کچھ الفاظ بھی کندہ ہیں، بعض مٹی کے برتنوں اور تانبے کے ٹکڑوں پر بھی کچھ لکھا ہوا ہے۔ ابھی تک ان کی زبان تو نہیں سمجھ میں آئی ہے اور نہ یہ الفاظ پڑھے جا سکتے ہیں لیکن ان سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ لوگ پڑھنے لکھنے کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے لکھنے کا رُخ ہندی کے خلاف عربی کی طرح دائیں سے بائیں تھا۔

ان دونوں شہروں میں عالی شان محلوں اور قلعوں کے آثار تو ضرور ملے مگر کسی بڑی عبادت گاہ کا پتہ نہیں چلا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عبادت گاہوں سے زیادہ مکانات آراستہ کرنے کی طرف متوجہ تھے۔ البتہ مورتیوں اور مہروں وغیرہ پر کندہ تصویروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کے ساتھ مختلف دیوی دیوتاؤں کو شریک کرنے لگے تھے۔ دھرتی ماتا یا کالی مائی اور شیو جی وغیرہ کی پوجا ہونے لگی تھی۔ بعض درخت اور جانور مثلاً پیپل اور سانڈ یا بچھڑے وغیرہ کی بھی پرستش ہوتی تھی۔ پوجا پاٹ کے مواقع پر ناچ باجے کا اہتمام ہوتا تھا اور بعض دیوی دیوتاؤں پر آدمی اور جانور بھی قربان کیے جاتے تھے۔ غرض مصر اور عراق کی طرح ہمارے ملک میں بھی شرک اور بت پرستی کا رواج ہو چکا تھا اور مہروں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں بھوت پریت پر اعتقاد اور جادو ٹونے نیز تعویذ گنڈے کا بھی بڑا زور ہو گیا تھا۔

باب ۲

دراوڑ

مورّخوں کا خیال ہے کہ یہ لوگ ہمارے ملک کے اصل باشندے نہ تھے، بلکہ عراق یا اس کے آس پاس کے رہنے والے تھے اور مغربی سرحد پار کرکے ہمارے ملک میں حملہ آور کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ چونکہ مقامی باشندوں کے مقابلے میں یہ لوگ دل و دماغ اور اللہ کی بخشی ہوئی دوسری صلاحیتوں اور سامان سے بہتر کام لینے والے نیز اچھے ہتھیاروں سے مسلح تھے اس لیے انہیں بہ آسانی غلبہ حاصل ہو گیا اور وہ رفتہ رفتہ جنوبی ہند تک پھیل گئے۔ دراوڑی لوگ انہیں کی نسل سے ہیں، جو آج بھی جنوبی ہند میں کروڑوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ پہلے ان کا رنگ روپ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ یہاں کی گرم آب و ہوا اور مقامی لوگوں سے شادی بیاہ کے باعث بعد کی نسلوں کا رنگ سیاہی مائل ہو گیا۔ بہرحال اپنے ڈیل ڈول اور جسم کی بناوٹ کے اعتبار سے یہاں کے قدیم باشندوں یعنی کول، بھیل، گونڈ، سنتھال وغیرہ سے دراوڑ مختلف نظر آتے ہیں۔

دراوڑ بہت دنوں تک پھلتے پھولتے اور ترقی کرتے رہے۔ انہوں نے محنت کر کے بہت سے جنگلات صاف کیے اور انہیں رہنے سہنے اور کاشت کے قابل بنایا۔ اللہ نے انہیں اپنی رحمتوں سے نوازا۔ ان کی کھیتی باڑی

اور دھن دولت میں برکت دی، اولاد اور مویشیوں میں اضافہ کیا، مگر جب انہیں
فارغ البالی نصیب ہوئی تو یہ لوگ شکر گزار بندے بن کر رہنے کے بجائے اللہ
سے بغاوت کرنے لگے۔ مختلف ہستیوں کو اس کا شریک ٹھہرایا۔ درختوں اور
جانوروں تک کو اپنا معبود بنا لیا۔ بتوں کی پرستش شروع کی اور ان پر انسانوں
اور جانوروں کو بھینٹ چڑھانے لگے، امرار اور حکومت کے ذمہ دار عیش و
عشرت میں پھنس گئے، اللہ کی مرضی پر چلنے کے بجائے اپنی پسند کے قاعدے
قانون گھڑ لیے اور رعایا پر خدائی ٹھاٹھ جمانا شروع کیا۔ بے کسوں اور مجبوروں کی
خبر گیری کرنے کے بجائے ان پر ظلم کرنے لگے۔ غریبوں کی گاڑھی کمائی سے
اپنے لیے عالی شان محل اور آرائش و زیبائش کے سامان تیار کیے۔ تمام کام
خادموں اور مملوکوں سے لینا شروع کیا اور خود کاہل آرام طلب ہو گئے۔ اب
ان کی صلاحیتیں مفید اور بناؤ کے کاموں پر خرچ ہونے کے بجائے مضر یا بگاڑ
کے کاموں پر خرچ ہونے لگیں۔ بہت دنوں تک انہیں اللہ کی طرف سے ڈھیل
ملتی رہی مگر جب پانی سر سے اونچا ہو گیا اور نیک لوگوں کی تنبیہہ سے بھی اصلاح
نہ ہوئی تو اللہ نے اس ملک کا انتظام ان سے چھین کر آریہ نام کی ایک بیرونی قوم
کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا۔ آریوں کی آمد پر ان لوگوں نے مزاحمت کرنی چاہی متعدد
جنگیں ہوئیں مگر میدان بالآخر آریوں ہی کے ہاتھ رہا۔ دراوڑوں کے عالی شان
محلوں اور مضبوط قلعوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور پنجاب و سندھ
سے ان کا نام و نشان مٹ گیا۔ ہماری عبرت کے لیے زمین نے اپنی تہوں میں
ان کی بستیوں کے کچھ کھنڈرات محفوظ کر لیے تھے جو آج چار ہزار سال بعد برآمد
ہوئے ہیں۔ پچیس تیس سال قبل کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ آریوں سے پہلے یہاں
کوئی متمدن قوم بھی آباد تھی۔ آریہ کون تھے؟ کہاں سے آئے اور ان کا رہن سہن

کیسا تھا؟ ان کے دور میں کیا واقعات پیش آئے؟ یہ باتیں تم اگلے سبق میں پڑھو گے۔

۱۔ ہمارے ملک میں پہلے کون لوگ بستے تھے؟ ان کا رہن سہن کیسا تھا؟
۲۔ دراوڑوں کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ ان کی نسل کے لوگ اب کہاں ملتے ہیں؟
۳۔ ہڑپا اور موہن جو داڑو کی کھدائی سے پرانے زمانے کے کیا حالات معلوم ہوئے؟
۴۔ دراوڑوں کی وہ کون سی خامیاں تھیں جن کے باعث انہیں ہٹا کر آریوں کو ان کا جانشین بنایا گیا؟

باب ۳

آریہ

"آریہ" معنی شریف و مجاہد معلوم ہوتا ہے نیک اور شریف لوگوں کی یہ کوئی زبردست ٹولی تھی، جس کے اوصاف اور پاکیزہ اصول کے باعث لوگ اسے آریہ کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔ مگر آگے چل کر یہ نام ایک قوم یا نسل کے لیے استعمال ہونے لگا۔ ہندوستان میں داخل ہونے سے قبل یہ ایک خانہ بدوش قوم تھی، جو چھوٹے چھوٹے متعدد قبیلوں میں بٹی ہوئی تھی۔ یہ لوگ مویشی پالتے تھے اور انہیں لے کر پانی چارے کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرا کرتے تھے۔ بعض قبائل تھوڑی بہت کاشت بھی کر لیا کرتے تھے۔ ان کا اصل وطن تو معلوم نہیں غالباً روس کے جنوبی گیاہستانوں میں اُن کی بود و باش تھی۔ جب ان کی تعداد میں اضافہ ہوا اور مویشیوں کے لیے پانی چارہ اور اپنے لیے غذا حاصل کرنے میں زحمت پیش آنے لگی تو یہ لوگ اِدھر اُدھر پھیلنا شروع ہوئے۔ کچھ قبیلوں نے یورپ، ایران، عراق اور مصر وغیرہ کا قصد کیا اور بعض قبیلے افغانستان ہوتے ہوئے شمالی مغربی درّوں کی راہ ہمارے ملک میں داخل ہوئے۔ یہاں انہیں سب سے پہلے پنجاب اور سندھ کے دراوڑوں سے سابقہ پڑا۔ آریہ انکے مقابلے میں کم متمدن تھے۔ انہیں نہ تو عالی شان محل بنانا آتا تھا، نہ آرائش و

زیبائش کے لیے خوبصورت سامان و زیورات۔ ان کی تعداد بھی نسبتاً کم تھی، مگر تھے بہت قوی، جفاکش اور بہادر۔ شان و شوکت بگھارنے یا نسوانی چونچلوں میں پڑنے کے بجائے ان لوگوں نے اچھے سے اچھے ہتھیار بنانے اور اپنا اخلاق درست کرنے کی زیادہ کوشش کی تھی۔ انہوں نے دنیا کی دوسری متمدن قوموں سے پہلے لوہا پگھلا کر جنگلی سامان بنانا سیکھ لیا تھا اور ایک سردار کی راہ نمائی میں منظم جدوجہد کرنے کی مشق بھی بہم پہنچالی تھی، چنانچہ مقابلے میں میدان آریوں کے ہاتھ رہا اور دراوڑوں کو اپنی کثرتِ تعداد کے باوجود منہ کی کھانی پڑی۔ ان میں کچھ تو جنگ میں کام آگئے اور کچھ نے بھاگ کر پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ لی، باقی غلام بنا لیے گئے۔ اِن کے مکان اور کھیتوں پر آریوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس طرح مالک الملک نے دراوڑوں کی کمزوری اور سرکشی کے باعث پنجاب اور سندھ کی سرزمین ان سے چھین کر آریوں کے حوالے کر دی۔

آریوں کا رہن سہن اور عقائد

یہ لوگ ٹھنڈے ملک کے رہنے والے تھے۔ ان کا جسم گٹھا ہوا، رنگ گورا، قد لمبا، اور چہرہ شاندار تھا۔ بہادری اور محنت کے کاموں سے انہیں خاصا لگاؤ تھا۔ یہ لوگ مذہب کے بہت پابند تھے۔ اس ملک میں آئے تو نہایت ہی سادہ اور اصولی زندگی بسر کرتے تھے۔ عام طور پر کھیتی باڑی یا مویشی پالنا ان کا پیشہ تھا گاؤں میں لکڑی کا مکان یا جھونپڑیاں بنا کر رہتے تھے۔ ذات پات کا کوئی رواج نہ تھا ہر شخص کو اس کی لیاقت اور صلاحیت کے مطابق سماج میں درجہ حاصل ہوتا۔ لائق اور ایماندار لوگ سردار چنے جاتے۔ اپنے سردار کی اطاعت و فرمانبرداری یہ لوگ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ خاندان کا بڑا بوڑھا گھر کا ذمّے دار ہوتا۔ تمام اہل خانہ اس کا ادب کرتے اور حکم مانتے۔ عورتوں کے ساتھ مناسب برتاؤ ہوتا۔ شوہر کا

انتخاب کرنے میں انہیں پوری آزادی حاصل تھی۔ بیوہ عورتوں کی شادی میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا تھا۔ شادی عموماً بالغ ہونے کے بعد ہوتی تھی بچپن کی شادی کا رواج نہ تھا۔ ان کے یہاں دین کی کوئی تفریق نہ تھی۔ زندگی کے تمام شعبوں کیلیے اصول اور ضابطے مقرر تھے جو مقدس شمار کیے جاتے اور جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کے جدّامجد منوؔ نے تیار کیے ہیں۔ راج کاج کے لیے وہی لوگ منتخب کیے جاتے جو ان ضابطوں کے عالم ہوتے اور قوم کو ان کے مطابق چلانے کی صلاحیت رکھتے۔ ان کا ہر فرد سپاہی تھا۔ ضرورت پڑنے پر چھوٹے بڑے سب جنگ میں شریک ہوتے۔ نوجوانوں کو تیر اندازی اور ہتھیار چلانے نیز ذمے داریاں سنبھالنے کی باقاعدہ تربیت دی جاتی۔ بُت پرستی کا ان کے یہاں نام ونشان بھی نہ تھا۔ یہ لوگ آنے والی زندگی میں اعمال کی جزا و سزا کے قائل تھے۔ خدا کی ذات اور اس کی بعض صفات کا تصوّر موجود تھا۔ مختلف کاموں پر متعین فرشتوں کو وہ دیوتا کا نام دیتے اور ان کی تعریف میں اشعار مرتب کرتے اور پڑھتے مگر انہیں صاحبِ اختیار نہیں سمجھتے تھے، بلکہ عرش کے مالک اور اس کی آکاش بانی (آسمانی آواز یا فرمان) کا تابع فرمان اور اُسی کی مرضی پوری کرنے والا شمار کرتے تھے، چنانچہ آڑے وقت پر اسی کو مدد کے لیے پکارتے، اُسے خوش کرنے کے لیے پوجا پاٹ، یگیہ اور قربانی کرتے۔ موسلادھار بارش، اچھی پیداوار کے اور دشمنوں پر غلبہ پانے کے لیے اُسی سے دعائیں مانگتے اور آسمان کو اس کا مسکن سمجھ کر اسی کی طرف ہاتھ اٹھاتے۔

آریوں کی خدمات

ملک کا انتظام سنبھالنے کے بعد اس گروہ نے متعدد بناؤ کے کام کیے۔ دراوڑوں کی مدد سے شمالی ہند کے بیشتر حصّوں کو جنگلات سے صاف کر کے قابل کاشت بنایا، وحشی

اور جنگلی انسانوں کو بھلے مانسوں کی طرح رہنا سکھایا، معاشرتی زندگی میں اصلاح کی، مختلف علوم و فنون کی داغ بیل ڈالی، زمین کے خزانوں کو مفید کاموں میں استعمال کیا، کپڑا بننے، چمڑا کمانے دھاتوں کو صاف کر کے کارآمد چیزیں بنانے اور جڑی بوٹیوں سے دوا علاج کرنے کے فن کو رواج دیا لیکن ایک وقت آیا جب کہ اقتدار کے نشے میں ان سے بھی زیادتیاں ہوئیں۔ مثلاً دراوڑوں اور دوسرے مقامی باشندوں کے ساتھ بدسلوکی، معمولی باتوں پر ان کا قتلِ عام، آپس میں خانہ جنگی وغیرہ مگر ان کی غلطیوں پر ٹوکنے اور انہیں دھرم پر چلانے کے لیے رشی منی اور نیک لوگ بھی اٹھتے رہے اور ان کی کوششوں سے اصلاح بھی ہوتی رہی چنانچہ اللہ نے انہیں مہلت دی اور صدیوں اس ملک میں بناؤ کے جو کام ہوئے وہ اسی قوم کی کوششوں کا نتیجہ تھے۔

بھرت

آریوں میں کئی بہت مشہور فرماں روا گزرے ہیں ان میں ایک بھرت تھے۔ بھرت ہی کے نام پر ہمارے ملک کا نام بھارت ورش یا بھارت رکھا گیا ہے۔ کہتے ہیں ان کی ماں شکنتلا کو ایک رشی نے جنگلوں میں پالا اور تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا تھا۔ دشینت نام کا ایک سردار شکار کھیلنے اس جنگل میں گیا، شکنتلا سے ملاقات ہوئی، اس کے حسنِ سلوک اور بھولے پن سے متاثر ہو کر شادی کر لی مگر اسے وہیں جنگل میں چھوڑ دیا۔ بھرت پیدا ہوا تو اس کی پرورش بھی وہیں جنگل میں ہوئی۔ چنانچہ یہ بچہ بہت ہی نڈر اور بہادر ہو گیا۔ بڑے ہو کر اس نے باپ کی گدّی سنبھالی اور شمالی ہند کا بہت مشہور فرماں روا ہوا۔ ان ہی کا خاندان آگے چل کر چندر بنشی کہلایا۔ کورو اور پانڈو اسی خاندان سے تھے ان کے درمیان تخت کے لیے بڑی زبردست خانہ جنگی ہوئی تھی جس کا تذکرہ مہابھارت کتاب میں ہے۔

ہرش چندر

ایک اور فرماں روا ہرش چندر ہوا ہے۔ یہ شمالی ہند کے ایک علاقے کا سردار تھا۔ اس نے اپنے کو کبھی عوام سے بالاتر نہ سمجھا۔ تاہم لوگ اسے راجاؤں میں شمار کرتے ہیں حالانکہ وہ راجا کہلانا پسند نہیں کرتا تھا اور اس لفظ کو درا وڑوں کا "تحفہ" کہتا تھا۔ وہ بہت ہی خدا ترس اور فقیر منش انسان تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ تمام زندگی کبھی جھوٹ نہ بولا اور خدا نے جو فرائض اس پر عائد کیے تھے ان کو پورا کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ اس نے تن من دھن سے رعایا کی فلاح و بہبود کی کوشش کی۔ اس کا قول تھا کہ فرماں روا کو فرمانروائی کا حق اسی وقت تک حاصل ہے جب تک وہ رعایا سے وصول کی ہوئی رقم کو رعایا ہی کی بھلائی پر خرچ کرتا ہے۔ چنانچہ لوٹ کھسوٹ کر اس نے خزانہ بھرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ کسی سائل کا سوال رد نہ کیا' غریبوں اور محتاجوں کا ہمیشہ خیال رکھا۔ اپنے عیش و آرام پر رعایا کا پیسہ خرچ کرنا کبھی پسند نہ کیا۔ مگر افسوس کہ اس نیک طینت شخص کو بشوامتر نے ایک آزمائش میں ڈال کر سرداری سے محروم کر دیا۔ بشوامتر کے مطالبے پر ہرش چندر نے بخوشی حکومت سے دست برداری دے دی اور کہا "میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے ذمّے داری کے اس بھاری بوجھ کو اپنے سر پر لے کر مجھے اس سے نجات دلا دی۔ ممکن تھا مجھ سے کوتاہیاں ہوتیں اور میں پرماتما کے یہاں پکڑا جاتا۔"

ہرش چندر ہی کا خاندان آگے چل کر سورج بنشی کہلایا۔ راجہ دشرتھ اسی خاندان سے تھے جن کے بیٹے رام چندر جی کی داستان رامائن کی کتاب میں درج ہے۔

آریہ ہمارے ملک میں کب آئے؟ اس کے متعلق ابھی ٹھیک معلومات نہیں ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ڈھائی تین ہزار قبل مسیح ان کی آمد شروع

ہوئی ہے اور کچھ وقفے کے بعد ان کے بہت سے قبیلے آئے اور اپنے پیش روؤں کو جنوب مشرق کی طرف دھکیلتے رہے۔ انہیں ایک دوسرے کی جگہ لینے کے لیے آپس میں اور آگے بڑھنے کے لیے دراوڑوں سے متعدد جنگیں کرنی پڑیں۔ ان جنگوں میں سے دو کا حال تم اپنے سبق میں پڑھو گے۔

۱۔ آریہ کون تھے؟ ہمارے ملک میں یہ کس طرح پہونچے؟ اس ملک پر ان کے کیا احسانات ہیں؟

۲۔ آریوں نے قلتِ تعداد کے باوجود دراوڑوں کو کس طرح مغلوب کیا؟

۳۔ قدیم زمانے کے آریوں کا رہن سہن کیسا تھا؟

۴۔ بھرت اور ہرش چندر کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟

باب ۴

رامائن کی کہانی

رامائن کے مصنف بالمیک ہیں۔ اس کتاب میں آریوں اور جنوبی ہند کے دراوڑوں کی جنگ کا تذکرہ ہے۔ یہ جنگ غالباً اس وقت پیش آئی ہے، جب آریہ دوآبے سے بڑھ کر شمالی ہند میں بنگال کی سرحد کے قریب تک پہونچ چکے تھے اور اب بندھیاچل کی پہاڑیوں کو پار کر کے جنوبی ہند میں پھیلنا چاہتے تھے۔

لکھنؤ سے کوئی سو میل مشرق میں اجودھیا نام کا ایک بہت پرانا شہر ہے۔ یہ شہر دریائے گھاگھرا کے کنارے آباد ہے۔ آریوں کی ایک مشہور قدیم ریاست کوشل کی راجدھانی رہ چکا ہے۔ کوشل کے راجہ اپنے کو سورج بنشی کہتے تھے۔ اسی خاندان میں رگھو ایک مشہور راجہ ہوا ہے۔ اسی کے نام پر اس خاندان کا نام "رگھوکل" پڑا۔

رگھو خاندان میں ایک مشہور راجہ دشرتھ ہوئے ہیں۔ دشرتھ کی تین بیویاں تھیں کوشلیا، سمترا اور کیکئی۔ ان تینوں بیویوں سے راجہ کے چار بیٹے تھے۔ کوشلیا سے رام، سمترا سے لکشمن اور شتروگھن، کیکئی سے بھرت۔ رام سب میں بڑے تھے۔ ان بھائیوں میں آپس میں بڑا پریم تھا۔ وشوامتر ان کے اتالیق مقرر ہوئے انہوں نے ان کی اچھی تعلیم و تربیت کی، تیر اندازی اور جنگی فنون سکھائے۔ وشوامتر آبادیوں سے دور جنگلوں میں رہتے اور وہیں تنہائی میں پوجا پاٹ کیا کرتے تھے۔ جنگلی قومیں ان کے گیان، دھیان اور پوجا پاٹ میں خلل ڈالا کرتی تھیں چنانچہ

ان کی سرکوبی کے لیے وہ اپنے ساتھ رام اور لکشمن کو بھی لیتے گئے۔

یہ لوگ وشوامتر کی کٹیا میں مقیم تھے کہ متھلا کے راجہ جنک کی راج کماری سیتا کے سوئمبر کی اطلاع ملی۔ وشوامتر ان دونوں کو لے کر وہاں پہنچے۔ ایک بہت بڑی کمان کا چلّہ چڑھانا سوئمبر کی شرط تھی۔ سوئمبر میں بہت سے راجہ مہاراجہ شریک ہوئے تھے، مگر چلّہ چڑھانا تو درکنار، اکثر لوگ کمان کو اٹھا بھی نہ سکے۔ رام نے زور لگایا تو کمان دو ٹکڑے ہوگئی۔ بالآخر سیتا سے ان کی شادی ہوئی اور وہ خوش خوش گھر لوٹے۔

راجہ دشرتھ اب بوڑھے ہو چلے تھے۔ انہوں نے راج پاٹ رام کے سپرد کرکے زندگی کے باقی دن پوجا پاٹ میں گزارنے کی ٹھانی، رام کو ولی عہد بنانے کی تاریخ مقرر کردی گئی مگر عین موقع پر کیکیئی نے رکاوٹ ڈالی اس نے راجہ دشرتھ سے ایک بار دو وعدے لے لیے تھے اس وقت ان وعدوں کو پورا کرنے کی مانگ کردی۔ اس نے کہا کہ راج پاٹ تو میرے بیٹے بھرت کو دیا جائے اور رام کو چودہ سال کا بن باس۔ دشرتھ اس کی ضد پوری کرنے پر مجبور ہوئے۔

رام چندر جی بن کو سدھارے۔ سیتا اور لکشمن بھی ساتھ گئے۔ کہتے ہیں دشرتھ کو جدائی کا بڑا قلق ہوا اور وہ اسی غم میں مرگئے۔ بھرت ننھال میں تھے آئے تو اپنی ماں پر بہت برسے۔ پھر جنگل جاکر رام چندر سے لوٹنے اور راج سنبھالنے کی درخواست کی، مگر جب وہ بن باس کی مدت پوری کیے بغیر لوٹنے پر راضی نہ ہوئے تو بھرت ان کی کھڑاؤں لیتے آئے اور تخت پر اسے قائم مقام کی حیثیت سے رکھ کر حکومت کرنا شروع کیا۔

رام چندر جی نے لکشمن اور سیتا کے ساتھ جنوبی جنگلات کا رُخ کیا۔ اس وقت جنوبی ہند میں دراوڑوں اور دوسری جنگلی قوموں کا راج تھا۔ ان میں

لنکا کا راجہ راون سب سے مشہور فرمانروا تھا۔ ایک دن اس کی بہن سوپنکھا نے رام سے شادی کی درخواست کی۔ رام نے اسے لکشمن کے پاس بھیج دیا۔ لکشمن نے انکار کیا تو سوپنکھا نے ضد کی۔ لکشمن نے خفا ہوکر اس کی ناک اور کان کاٹ لیے۔ جب راون کو پتہ چلا تو وہ بدلہ لینے نکل کھڑا ہوا، اور ایک دن سیتا جی کو اٹھا بھی لے گیا۔ رام نے ہنومان، سگریو اور دوسرے دراوڑوں اور جنگلی لوگوں کی مدد سے لنکا پر چڑھائی کی۔ راون اور اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے سیتا جی واپس ملیں لنکا تباہ ہوگیا۔ راون کا بھائی بھبھیکن، جو دوران جنگ میں ہی رام کا ساتھی بن چکا تھا، رام کی مدد سے وہی لنکا کا نیا راجہ مقرر ہوا۔ چودہ سال کی مدّت پوری کر کے رام چندر جی اجودھیا لوٹے۔ یہاں بڑی دھوم دھام سے ان کا جشنِ تاج پوشی منایا گیا اور وہ راج پاٹ کرنے لگے۔

کچھ دن بعد رعایا میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ لوگ رام چندر جی کو طعنے دینے لگے کہ بھگائی ہوئی بیوی کو دوبارہ رکھ لیا۔ اس پر انہوں نے سیتا جی کو گھر سے نکال دیا۔ وہ جنگلات میں جا کر بالمیک کے پاس ٹھہریں۔ وہاں ان کے لو اور کش دو بیٹے پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر ان دونوں نے رام چندر جی کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور لکشمن کو گرفتار کر کے لے گئے۔ بعد میں سیتا جی کے سمجھانے پر صلح ہوگئی۔ بالمیک کے کہنے سننے پر رام چندر جی نے سیتا جی کو واپس لینا چاہا مگر کہا جاتا ہے کہ زمین پھٹی اور سیتا جی اسی میں سما گئیں۔ رام چندر جی کو ان واقعات سے بڑا افسوس ہوا اور وہ گھاگھرا میں جا ڈوبے۔ جس جگہ وہ ڈوبے تھے وہاں ایک گھاٹ بنا دیا گیا ہے، جو گپتار گھاٹ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ گھاٹ فیض آباد کے شمال مغرب میں دریائے گھاگھرا کے کنارے بنا ہوا ہے۔

۱۔ رام چندر جی کون تھے ؟ انہیں بن باس کیوں ملا ؟
۲۔ راون سے ان کی کیوں جنگ ہوئی ؟ اس جنگ کا کیا نتیجہ نکلا ؟
۳۔ اس کہانی کو اختصار سے اپنے الفاظ میں لکھو۔
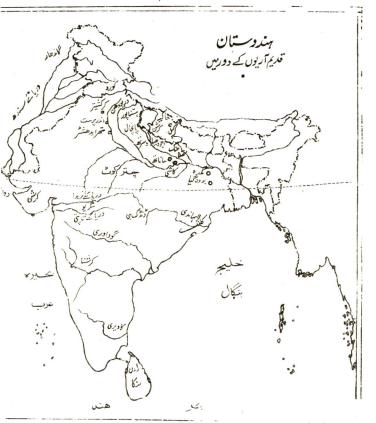
ہندوستان
قدیم آریوں کے دور میں
گاندھار
دریائے سندھ
کورو
کرکشیتر
ہستناپور
اندرپرست
پانچال
چترکوٹ
کاشی
مگدھ
بودھ گیا
دریائے نربدا
دریائے تاپتی
ڈنڈک بن
مہاندی
کلنگ
گوداوری
کرشنا
بحیرہ
عرب
خلیج
بنگال
کاویری
لنکا
ہند

باب ۵

مہابھارت کی کہانی

مہابھارت کے مصنّف وید ویاس کہلاتے ہیں۔ مگر یہ ضخیم کتاب صدیوں میں لکھی گئی ہے اور اس کی تصنیف میں کئی آدمیوں کا ہاتھ ہے اِس میں آریوں کی ایک ملک گیر جنگ کا تذکرہ ہے جو کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان ہوئی تھی اور جس میں تمام آریہ فرماں رواؤں نے کسی نہ کسی طرف سے شرکت کی تھی۔ یہ جنگ غالباً اس وقت پیش آئی جب آریہ لوگ ہرات سے سنگاپور تک پھیل چکے تھے۔

بہت دنوں کی بات ہے، عیسیٰؑ سے بھی غالباً ہزار برس پہلے دلّی کے قریب ہستناپور میں آریوں کے ایک خاندان کی حکومت قائم تھی اِس خاندان کے لوگ اپنے کو چندر بنشی کہتے تھے۔ مہاراجہ بھرت جس کے نام پر ہمارے ملک کا نام بھارت پڑا اسی خاندان کا سب سے مشہور راجہ ہوا ہے۔ اسی کی اولاد میں ایک راجہ وچتر ویریہ ہوا ہے جس کے دو بیٹے دھرت راشٹر اور پانڈو تھے۔ دھرت راشٹر پیدائشی اندھا تھا اس لیے راجہ کے مرنے پر چھوٹے لڑکے پانڈو کو راج گدّی ملی۔ دھرت راشٹر کی متعدد بیویاں تھیں جن سے سو بیٹے پیدا ہوئے ان میں سب سے بڑا دریودھن تھا۔ اس کی ماں قندھاری تھی۔ دھرت راشٹر کے بیٹے کورو کہلاتے تھے۔ پانڈو کے پانچ بیٹے تھے، یدھشٹر[۱]، بھیم[۲]، ارجن[۳]، نکل[۴]

سہدیو۔ کنتی پہلے تین بیٹوں کی ماں تھی اور مدری آخری دو بیٹوں کی ماں تھی۔ یہ لوگ پانڈو کہلاتے تھے۔

کورو اور پانڈو کی تعلیم و تربیت ایک ہی ساتھ ہوئی۔ کشتی میں دریودھن اور بھیم کا جوڑ رہتا تھا۔ ارجن تیر اندازی میں ماہر تھا۔ یدھشٹر اپنی صدق گوئی کے لیے مشہور تھا۔ پانڈوؤں کی شہرت سے دریودھن جلتا تھا۔ اُن کے خلاف اس کے دل میں بے حد نفرت تھی۔ پانڈو کی موت کے بعد دھرت راشٹر نے اس کے بڑے بیٹے یدھشٹر کو ولی عہد بنانا چاہا لیکن دریودھن اسے کب گوارا کر سکتا تھا وہ تو خود راج گدّی پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ پانڈوؤں کو وہ اپنی راہ کا روڑا سمجھتا تھا چنانچہ اس نے انہیں ختم کرنے کی سازش کی اِن کے رہنے کے لیے لاکھ کا ایک گھر تعمیر کرایا۔ جب وہ رہنے لگے تو ایک رات اس مکان میں آگ لگانے کا منصوبہ بنایا، لیکن پانڈوؤں کو اس سازش کا بروقت علم ہوگیا۔ وہ چپکے سے نکل بھاگے۔

بارہ سال تک اپنی ماں کنتی کے ساتھ جنگلوں میں مارے مارے پھرے۔ اتفاق سے انہیں دنوں پانچال دیس کے راجہ دروپد کی بیٹی دروپدی کا سوئمبر ہونے والا تھا۔ سوئمبر میں تیر اندازی کا بہت ہی سخت امتحان رکھا گیا تھا۔ ایک کھمبے کے اوپری سرے پر ایک مچھلی ٹکا دی گئی تھی، جو ہلتی رہتی تھی۔ نیچے تیل کا ایک کڑھاؤ تھا جس میں مچھلی کا عکس پڑتا تھا۔ عکس دیکھ کر مچھلی کی آنکھ کو تیر کا نشانہ بنانا تھا۔ ارجن نے شرط پوری کی اور دروپدی سے اس کا بیاہ ہوگیا۔ اس رشتے کے بعد پانڈوؤں کو پانچال کے راجہ کی حمایت حاصل ہوگئی اب پانڈو وطن لوٹے تو دھرت راشٹر نے انہیں آدھا راج سونپ دیا۔ یدھشٹر نے اندر پرست (دہلی) کو اپنی راجدھانی بنا کر حکومت شروع کی۔

چند ہی دنوں میں اس کی شہرت بہت بڑھ گئی۔ یہ بات دریودھن ایسے

حاسد کے لیے ناقابلِ برداشت تھی چنانچہ اس نے پانڈوؤں کو مٹانے کی ایک نئی چال چلی ۔ انہیں جوا کھیلنے پر آمادہ کر لیا ۔ جوئے میں پانڈو اپنا راج پاٹ، دھن دولت، گھر بار سب کچھ ہار گئے یہاں تک کہ رانی دروپدی کو بھی داؤں پر رکھ دیا۔ آخر میں جوئے کی ایک شرط کے مطابق انہیں تیرہ سال جنگلوں میں گزارنا تھا چنانچہ اپنی ناسمجھی اور دریودھن کی چال سے ایک بار پھر انہیں اِدھر اُدھر کی خاک چھاننی پڑی ۔

بن باس کی میعاد ختم ہونے پر پانڈوؤں نے اپنا راج واپس مانگا جس کے جواب میں دریودھن نے کہا " مانگنے سے کہیں راج ملا کرتا ہے بازو میں قوّت ہو تو مجھ سے چھین لو ۔ میں قوت آزمائی سے پہلے سوئی کے ناکے کے برابر بھی زمین نہیں دوں گا ۔"

یہ حالت دیکھ کر ارجن کی درخواست پر دوارکا کے راجہ شری کرشن جی نے مداخلت کر کے معاملے کو نپٹانا چاہا اور دریودھن کو انصاف کی تلقین کی مگر اس ہٹ دھرم نے ایک نہ سنی اور یہی کہتا رہا کہ " بغیر لڑے میں سوئی کی نوک بھر بھی زمین نہ دوں گا ۔"

اب جنگ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا مگر پانڈو اور خاص کر ارجن لڑائی کو ناپسند کرتے تھے ۔ شری کرشن نے ارجن کو لڑائی کی اہمیت سمجھائی اور پانڈوؤں کو لڑنے کا مشورہ دیا ۔ کرکشیتر میں دونوں کا مقابلہ ہوا ۔ جنگ میں پچاس لاکھ فوج نے حصّہ لیا ۔ بڑے گھمسان کا رَن پڑا، خون کی ندیاں بہہ گئیں ۔ اٹھارہ دن تک مسلسل جنگ ہوتی رہی ۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے ۔ پورے میدان میں لاشیں ہی لاشیں دکھائی دیتی تھیں ۔ ہزاروں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے ۔ کوروؤں کے مقابلے میں پانڈوؤں کی فوج اگرچہ تعداد میں کم تھی، مگر چونکہ

لوگ اپنے حق کے لیے لڑ رہے تھے اس لیے میدان انہیں کے ہاتھ رہا۔ دریودھن کا پورا خاندان اور اس کے حلیف چُن چُن کر مارے گئے صرف دھرت راشٹر بچا۔ پانڈو جیت تو گئے مگر یہ سودا انہیں بھی بہت ہی مہنگا پڑا۔ جنگ کے نتائج سے یہ لوگ بہت ہی دل برداشتہ ہوئے، راج حاصل کرنے کے لیے انہیں اپنے بھائی بند اعزّا واقارب کے خون سے ہاتھ رنگنا پڑا تھا۔ جنگ کے ہولناک مناظر رہ رہ کر یاد آتے تھے، آخر راج کاج اور دنیا داری سے انہیں نفرت ہوگئی۔ انہوں نے راج گدّی تو ارجن کے پوتے پرکشت کے حوالے کی اور خود گھر بار چھوڑ کر ہمالیہ پربت کا رخ کیا اور وہیں برف میں گل کر مر گئے۔ سری کرشن جو اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم بھی تھے اپنے ملک دوارکا کو لوٹ آئے، مگر ان کی طبیعت بھی اداس ہوتی چلی گئی اور وہ اپنا زیادہ وقت جنگل اور بنوں میں گذارنے لگے۔ لیکن ایک روز ایک چرواہے نے، جو غالباً دریودھن سے ہمدردی رکھتا ہوگا موقع پا کر سری کرشن کو جنگل میں قتل کر دیا۔

مہابھارت کے بعد ہندوستان میں آریوں پر انحطاط اور زوال کی حالت طاری ہوگئی۔

۱۔ مہابھارت کس کی تصنیف ہے؟ اس کتاب میں کیا واقعہ مذکور ہے؟

۲۔ یہ جنگ کن کن کے مابین ہوئی؟ جنگ کے اسباب کیا تھے؟

۳۔ پانڈو کون تھے؟ دریودھن ان سے کیوں جلتا تھا؟

۴۔ دریودھن نے پانڈوؤں کو ستانے کے لیے کیا کیا ترکیبیں کیں؟ وہ اپنی مکّاریوں میں کہاں تک کامیاب ہوا؟

۵۔ کورو اور پانڈو کے درمیان سمجھوتہ کرانے کے لیے کرشن جی نے کیا

کوشش کی؟ آخر میں پانڈو کو جنگ پر کس طرح آمادہ کیا؟

۶۔ جنگ کا نتیجہ کیا ہوا؟

۷۔ کرشن جی اور پانڈوؤں کی موت کس طرح ہوئی؟

۸۔ درو پدی کے سوئمبر کا مفصّل حال بیان کرو؟

۹۔ مہا بھارت کی کہانی سے اس زمانے کے رہن سہن، اخلاق و عادات اور عقائد پر کیا روشنی پڑتی ہے؟

باب ۶

آریوں میں بگاڑ

تم نے رامائن اور مہابھارت کی کہانیاں پڑھیں، مزہ تو آیا ہوگا۔ یہ دونوں ہندوؤں کی مذہبی کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ وید بھی اُن کی مذہبی کتابیں شمار ہوتے ہیں۔ وید چار ہیں (۱) رِگ وید (۲) سام وید (۳) یجروید (۴) اتھروید ویدوں کو ہندو مقدّس کتاب مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ خالق کا کلام ہے۔ ویدوں کی زبان سنسکرت ہے۔

ہر وید کے تین حصّے ہیں۔ ۱۔ سنگ ہتا ۲۔ براہمن ۳۔ اپنشد

سنگ ہتائیں دراصل نظم میں وید کے متن ہیں۔ براہمن ان متنوں کی تشریح و تفسیر اور اپنشدوں میں خدا، روح اور کائنات کی حیثیت، ہر ایک کا مقام اور ایک دوسرے سے تعلق بتایا گیا ہے۔ اپنشدوں کو "ویدانت" بھی کہتے ہیں۔

ویدوں میں رِگ وید سب سے پُرانا شمار ہوتا ہے، مگر اس کے بعض حصّوں کی زبان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حصّے بعد میں تصنیف کر کے اسی میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ باقی تین ویدوں میں دراصل رگ ویدہی کے کچھ منتخب منتر ہیں، اور کچھ نئے منتروں کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اتھروید جو ان میں

سب سے آخری کتاب سمجھی جاتی ہے اس میں جادو، منتر، ٹونے ٹوٹکے وغیرہ بہ کثرت دیے گئے ہیں۔ اُن سے پتہ چلتا ہے کہ رفتہ رفتہ آریہ بھی نہ صرف ان چیزوں کے قائل ہو گئے تھے، بلکہ نیچے درجے کے پجاری ان میں مہارت حاصل کرنے کی باقاعدہ کوشش کرتے تھے۔

پھر گورشی نے منو کی طرف منسوب کیے جانے والے قوانین کو منوسمرتی کے نام سے مرتب کر دیا تھا۔ یہی اب آریوں کی سیاسی اور سماجی زندگی کے لیے قانون کی کتاب سمجھی جانے لگی تھی۔

خیال ہے کہ یہ تمام کتابیں عیسیٰؑ کی پیدائش سے قبل تصنیف ہو چکی تھیں مگر دو ایک کے علاوہ باقی تمام کتابوں میں مختلف ادوار میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے۔ ان کتابوں کے مطالعے سے اس دور کے رہن سہن عقائد، خیالات، راج کاج کے طریقے وغیرہ کا بہت کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ ذات پات

آریوں نے اپنے کو تین مستقل گروہوں میں تقسیم کر لیا تھا۔

۱۔ برہمن۔ ان کا درجہ سماج میں سب سے اونچا تھا۔ ان کا خاص کام پڑھنا پڑھانا، یگیہ کرنا کرانا، دان لینا دینا اور مذہبی امور میں سب کی رہبری کرنا تھا۔

۲۔ چھتری۔ برہمنوں کے بعد سماج میں یہی لوگ، اونچے سمجھے جاتے، ان کا کام راج کاج، رعایا کی خبر گیری، جنگی خدمات، یگیہ کرنا اور دان دینا وغیرہ تھا۔ انہیں پڑھنے لکھنے کے مواقع بھی مل جاتے تھے چنانچہ ان میں بھی بہت سے عالم ہوئے ہیں۔

۳۔ ویش۔ ان کا خاص کام تجارت، صنعت و حرفت زراعت اور لین دین کرنا تھا۔ مذہبی امور پر یہ لوگ کافی خرچ کرتے تھے۔ پڑھنے لکھنے اور دیگر خدمات انجام دینے کا ان میں بھی رواج تھا۔

ابتدا میں یہ تقسیم لوگوں کی لیاقت، صلاحیت اور پیشوں کی وجہ سے عمل میں آئی تھی اور ایک طبقے کا فرد صلاحیت پیدا کر کے دوسرے میں شامل ہو سکتا تھا، مگر رفتہ رفتہ پیدائش کی بنیاد پر یہ تقسیم مسلط کر دی گئی، یعنی برہمن کی اولاد برہمن، چھتری کی چھتری، اور دیش کی دیش ہی ہونے لگی خواہ ان میں وہ اوصاف موجود ہوں یا نہ ہوں اور صلاحیت کے باوجود ایک کا فرد دوسرے میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ شروع میں ان تینوں گروہوں میں اتنی علیحدگی پسندی بھی نہ تھی جیسی آج کل ہے۔ اونچی ذات والے اپنے سے نیچی ذات والوں کی لڑکی سے شادی کر سکتے تھے، مگر رفتہ رفتہ یہ تعلقات ختم ہو گئے اور ان میں کا ہر طبقہ شاخ در شاخ ہو کر متعدد گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔ آج ملک میں لاتعداد ذاتیں ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنے کو دوسروں سے برتر یا کمتر سمجھتی ہے۔

اسی طرح مقامی باشندوں کے بھی ان لوگوں نے تین طبقے کر دیے تھے۔

۱۔ شودر۔ یہ وہ مقامی باشندے تھے، جنہوں نے آریوں کی سرداری تسلیم کر کے اپنے کو ان کی چاکری کے لیے پیش کر دیا تھا۔ یہ آریوں کی خدمت کرتے، انکے مویشیوں کی خبر گیری کرتے، ان کے لیے کاشت کرتے، ان کا پانی بھرتے، کپڑے دھوتے، بال تراشتے وقس علیٰ ہذا یہ لوگ اچھوت اور شودر (حقیر مخلوق) شمار ہوتے اور نہایت ذلیل نگاہوں سے دیکھے جاتے۔ بہر حال انہیں آبادیوں میں آنے جانے کی اجازت تھی۔ اب ان میں بھی متعدد شاخیں ہو گئی ہیں۔

۲۔ چانڈال:۔ یہ شودروں سے بھی زیادہ گرے ہوئے شمار ہوتے اور انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔ مرگھٹوں کی رکھوالی، بھنگیوں کے کام ان کے سپرد تھے۔ انہیں آبادیوں میں گھسنے کی اجازت نہ تھی مگر تھے یہ بھی محکوم آج کل کے مہتر بھنگی وغیرہ انہیں کی اولاد بتائے جاتے ہیں۔

۲۔ راکشش:۔ یہ مقامی باشندوں کا وہ گروہ تھا، جس نے آریوں کی سرداری قبول کرنے کے بجائے بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لی تھی، یا جنوبی ہند کے بیشتر حصّوں پر قابض تھے۔ یہ لوگ کبھی کبھی آریوں کی بستیوں پر چھاپہ مار جاتے اور ان سے اُن کی باہم جنگ رہتی۔ اس لیے آریہ انہیں ملیکش (کافر) کہنے لگے۔

چار آشرم

آریوں نے اپنی زندگی کو چار ادوار میں تقسیم کر لیا تھا اور ہر دور کی مدت پچیس سال رکھی تھی۔

۱۔ برہم چریہ اوستھا (اَن بیاہی زندگی) اس دور میں عمر کے ابتدائی پچیس سال شامل تھے۔ جنیو کی رسم ادا ہو جانے کے بعد لڑکے تعلیم شروع کرتے۔ عموماً دس سال کی عمر میں گروؤں کے پاس چلے جاتے۔ اس پوری مدّت میں بے بیاہے رہتے۔ گروؤں کے پاس قیام ہوتا اور دان پر گذر اوقات کرتے۔

۲۔ گرہستھ اوستھا (کاروباری زندگی) ۲۵ سال کی عمر میں شادی کر کے بال بچّوں کے ساتھ رہتے ہوئے روزی کماتے، روپیہ پیسے سے غریبوں، محتاجوں، طلبہ اور سادھوؤں کی مدد کرتے

۳۔ بان پرستھ آشرم۔ پچاس سال کی عمر میں گھر بار بال بچّوں کے حوالے کر کے جنگلات میں نکل جاتے، اکثر بیویاں ساتھ ہوتیں۔ جنگلات میں تپسیا اور عبادت کرتے۔ عام طور پر پھل پھلاری پر گذر اوقات ہوتی۔

۴۔ سنیاس آشرم۔ پچھتر سال کی عمر میں سنیاس لے لیتے اور ادھر اُدھر گھوم پھر کر لوگوں کو مذہبی باتیں بتاتے اور بھیک مانگ کر گذر اوقات کرتے۔

اس وقت کے مروجہ قوانین سے اندازہ ہوتا ہے کہ آریوں میں اب وہ پہلی سی سادگی اور حق پرستی باقی نہ تھی۔ راستی و راست بازی کے بجائے دھرم چند

ایسی رسموں کا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا جنہیں برہمنوں کی مدد کے بغیر ادا کرنا ممکن نہ تھا۔ یگیوں اور قربانیوں کی اتنی بھرمار ہو چکی تھی کہ عام لوگ انہیں انجام دے ہی نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ دھرم عوام کی روزانہ زندگی سے خارج ہو گیا۔ راج کاج اور سماجی زندگی میں دین دنیا کی تفریق ہونے لگی۔ سب سے بڑا دھرماتما وہ کہلاتا جو دنیا ترک کرکے جنگلوں میں تپسیا کرتا پھرتا، نہ اپنے نفس کے حقوق پہچانتا اور نہ متعلقین کے، اور اپنے جسم کو ایسی اذیتیں دیتا جو عام انسانوں کے بس میں نہ تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کا انتظام دھرماتماؤں کے ہاتھ سے نکل کر دنیا داروں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ چھوت چھات اور ذات پات کے بندھنوں نے سماج کا ایک عجیب ڈھانچہ بنا دیا تھا۔ شودروں اور عورتوں کو مختلف قسم کے حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا گویا کہ ان میں جان ہی نہیں ہے۔ قانون کی نظر میں سب انسان برابر نہ تھے بلکہ مختلف گروہوں کے لیے ایک ہی جرم کی مختلف سزائیں مقرر کی گئی تھیں۔ سماج میں طرح طرح کی اخلاقی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ جُوا، شراب، وعدہ خلافی، دوسروں کا حق مار لینا، بچیوں کو وبالِ جان سمجھنا وغیرہ عام ہو گیا تھا۔ شرافت اور رذالت کا معیار اچھے یا بُرے اعمال نہ تھے بلکہ کسی ذات میں پیدا ہو جانا تھا۔

ظاہر ہے اتنی غیر معمولی خامیوں کے بعد سوسائٹی میں انقلاب آنا فطری تھا چنانچہ کچھ مصلحین اٹھے، جن کا حال تم اگلے سبق میں پڑھو گے۔

۱۔ آریوں کی کون کون سی قدیم مذہبی کتابیں ہیں؟ وید کون کون سے ہیں؟ ان کے مختلف جزو کس نام سے پکارے جاتے ہیں؟

۲۔ منوسمرتی کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟

۳۔ ان کتابوں سے آریوں کے عقائد، رہن سہن وغیرہ کے متعلق کیا معلومات حاصل ہوتی ہیں؟

۴۔ ذات پات کا کیا مطلب ہے؟ آریوں نے اپنے کو کن کن ذاتوں میں تقسیم کر لیا تھا؟ مقامی باشندوں کے کون کون سے طبقے بنا دیے تھے؟

۵۔ زندگی کو کن کن حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا؟ ہر حصے کی تفصیلات بتاؤ۔

باب ۳

اصلاح کی کوششیں

یہ تھیں آریوں کی وہ خرابیاں، جو حضرت عیسیٰؑ سے بھی پانچ چھ سو سال قبل انتہائی شدت سے محسوس ہونے لگی تھیں۔ چنانچہ اصلاحِ حال کے لیے بہت سے لوگوں نے اپنے طور پر کوششیں کیں جن میں مہابیر اور گوتم بدھ سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ مہابیر کو جین مت کا بانی سمجھا جاتا ہے اور گوتم بدھ کو بدھ مت کا۔ یہ دونوں ایک ہی دور میں ہوئے اور ان کی اصلاحی کوششیں بھی تقریباً ایک ہی قسم کی تھیں۔ اس لیے گوتم بدھ اور ان کے کام کا تعارف کافی ہے۔

گورکھپور اور بستی کی شمالی سرحدوں کے قریب کپل وستو نام کا ایک اجاڑ مقام ہے چند سال پہلے یہ حصہ جنگلات سے ڈھکا ہوا تھا مگر اب اسے صاف کر دیا گیا ہے۔ مشہور ہے کہ قدیم زمانے میں یہاں شاکیہ قوم کے چھتری راجاؤں کی حکومت قائم تھی۔ اسی خاندان میں ایک راجہ سدھودھن ہوا ہے۔ گوتم بدھ اسی کے اکلوتے بیٹے تھے حضرت عیسیٰؑ سے ۵۶۳ء قبل پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کا نام سدھارتھ رکھا، اور بہت ہی لاڈ پیار سے پرورش کی۔ کیوں نہ ہو، تھے بھی تو راجہ کے بیٹے اور وہ بھی اکلوتے، مگر اپنی عمر کے عام بچوں سے ان کی طبیعت بالکل مختلف تھی۔ سیر و تفریح اور کھیل کود سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ عام طور پر

الگ تھلگ رہتے اور دُکھ درد، بیماری، بڑھاپے اور موت وغیرہ کو سوچا کرتے۔ راجہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کا بیٹا اس قسم کی فکروں میں گھلے چنانچہ اس نے ان کے لیے ایک خوبصورت محل بنوایا جسے مختلف قسم کے ساز و سامان سے آراستہ کیا۔ ناچ رنگ اور باجے گاجے وغیرہ ہر قسم کی دلچسپی کا انتظام کیا، مگر سدھارتھ کو یہ چیزیں اپنی طرف نہ کھینچ سکیں۔ وہ انسانوں کے دُکھ درد کا احساس کر کے کڑھا کرتے۔ ۱۶ سال کی عمر میں راجہ نے شادی کر دی مگر وہ اب بھی ہر وقت فکر مند ہی رہتے۔ ۳۰ سال کے ہوئے تو دکھوں سے نجات کا طریقہ معلوم کرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ماں باپ، بیوی بچے، گھر بار اور راج پاٹ، غرض کوئی چیز بھی رکاوٹ نہ بن سکی۔ پہلے تو کاشی کے مشہور برہمن عالموں کے پاس گئے، سادھو سنتوں کی سنگت کی، ان کی باتیں غور سے سنیں، ان کی ہدایات پر عمل کیا مگر ان کے بتائے ہوئے طریقوں سے سدھارتھ کو تسکین نہ ہوئی۔ پھر بارہ سال تک مارے مارے پھرے، فاقے کیے، جسم کو گھلایا، اپنے اوپر طرح طرح کی تکلیفیں اٹھائیں، مگر انسانیت کے دُکھوں کا علاج یہاں بھی نظر نہ آیا۔ آخر نڈھال ہو کر گیا کے قریب ایک پیپل کے نیچے بیٹھ کر غور و فکر کرنے لگے۔

کافی غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا میں راحت اور مرنے پر نجات اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب کہ لوگ :۔

۱۔ آپس میں محبّت سے پیش آئیں، کسی پر ظلم نہ کریں، یہاں تک کہ جانوروں کو بھی نہ ستائیں۔

۲۔ ہر حال میں سچ بولیں۔

۳۔ ماں باپ اور استاد کا حق پہچانیں، ان کی عزّت اور خدمت کریں۔

۴۔ پیدائش کی بنا پر کسی کو شریف اور کسی کو ذلیل نہ سمجھیں۔ لوگوں میں اگر

فرق کیا جا سکتا ہے، تو اچھے بُرے اعمال کی بنا پر نہ کہ ذات پات کی وجہ سے۔

۵۔ غریبوں، محتاجوں، مجبوروں اور بے کسوں کی مدد کریں۔

۶۔ ہر معاملہ میں میانہ روی اختیار کریں۔ نہ بلا وجہ اپنے کو گھلائیں، نہ عیش و عشرت میں پھنسیں۔

۷۔ حلال ذرائع سے روزی پیدا کریں۔

۸۔ یگیہ، تپسّیا اور برہمنوں کی گھڑی ہوئی دوسری رسومات کے ذریعے نجات حاصل کرنے کا تصور دل سے نکال دیں، خلوص نیّت سے نیک کام کریں، اور دوسروں کو بھی نیکیوں پر اُبھاریں۔

اس گیان کے حاصل ہو جانے کے بعد ان کا نام گوتم بدھ پڑا اب انہوں نے ان باتوں کی تبلیغ شروع کی۔ سب سے پہلے کاشی کے قریب سارناتھ گئے وہاں ان کو پانچ ساتھی مل گئے۔ اب سب نے مل کر جدو جہد شروع کی کچھ برہمنوں اور کچھ خود غرض لوگوں نے مخالفت کی مگر لا حاصل، ان کے پیروؤں کی تعداد بڑھتی گئی۔ جہاں جاتے، لوگ جوق در جوق ان کے وعظ میں شریک ہوتے۔ سیدھے سادے اصول تھے، سنسکرت کے بجائے لوگوں کی عام بول چال میں پیش کیے جاتے، پیش کرنے والا بھی نہایت مخلص اور اپنے اصول کا پابند تھا، لوگ اُن کی باتوں کو اپنے دل کی آواز سمجھتے چنانچہ بے حد متاثر ہوتے۔ انہوں نے راجاؤں کو بھی دعوت دی بمبسارا اور اجات شترو دو راجہ ان کے معتقد بن گئے۔ ان کے والد نے بھی باصرار بلا بھیجا۔ گئے اور والد، اہلیہ، بچے، اعزہ اقارب سب کو اپنا ساتھی بنا لیا۔ اس طرح چالیس پینتالیس سال تک تبلیغ و اشاعت کر کے ۴۸۳ق م میں دنیا سے کوچ کیا۔

گوتم بدھ کے پیش کردہ آٹھ اوامر اور دس نواہی بھی مشہور ہیں۔

اوامر۔ ۱۔ عقائد صحیح۔ ۲۔ ارادے نیک۔ ۳۔ اعمال درست رکھو۔ ۴۔ سچ بولو۔ ۵۔ حلال ذرائع سے روزی پیدا کرو۔ ۶۔ جدوجہد کا رخ درست رکھو۔ ۷۔ ہر معاملے میں محتاط رہو۔ ۸۔ جذب صادق پیدا کرو۔

نواھی۔ قتل[۱]، چوری[۲]، زناکاری[۳]، جھوٹ[۴]، بہتان[۵] تراشی، عیب[۶] چینی اور فحش[۷] کلامی سے پرہیز کرو، حرص[۸] و نفرت[۹] سے بچو اور جہالت[۱۰] سے پرہیز کرو۔

مگر یہ تو ان کی تعلیمات کا صرف روشن پہلو ہے۔ بُدھ مت کی مذہبی کتب دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مت میں نفس کُشی ترکِ دنیا اور اہنسا پر غیر معمولی زور دیا گیا ہے۔ بھیک کی روزی ہی سب سے پاک روزی شمار کی گئی ہے۔ خدا کی ذات وصفات کا بھی کوئی تصوّر پیش نہیں کیا گیا ہے، چنانچہ خدا پرستی کے بجائے بدھ کی پوجا ہونے لگی! اچھے لوگوں کے دنیا ترک کر دینے کی وجہ سے سارا انتظام بگڑے ہوئے لوگوں کے ہاتھ میں آ گیا مجرموں کو سزا دینا اور ظالموں کو ظلم سے باز رکھنے کی کوشش بھی اہنسا کے خلاف سمجھی جانے لگی معاشرہ پر ان باتوں کا جو مجموعی اثر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

باب ۸

سکندر کا حملہ

ذات پات، چھوت چھات، ظلم و ستم، بداخلاقی، غلط مذہبیت اور بے جا رسوم کی پابندی وغیرہ نے ہندوستانی سماج میں جو خرابیاں پیدا کر دی تھیں اور جن کے نتیجے میں مہا بھارت جیسی جنگِ عظیم رونما ہوئی تھی وہ گوتم بدھ کی تعلیمات نیز ان کے پیروؤں کی ان تھک کوششوں سے کسی حد تک دور ہو چکی تھیں، مگر ان لوگوں کی تگ و دو ابھی تک شمالی ہند میں بنگال، بہار اور یوپی وغیرہ تک محدود تھی۔

سندھ اور پنجاب ان کے حلقۂ اثر سے باہر تھے چنانچہ یہاں اب بھی متعدد سماجی خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ یہ حصّے کچھ عرصہ قبل تک ایرانیوں کے قبضے میں تھے۔ مگر رفتہ رفتہ یہاں چھوٹی چھوٹی بہت سی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی تھیں۔ یہ ریاستیں آپس میں برسرِ پیکار رہتیں۔ آئے دن معمولی باتوں پر جنگ ہوتی۔ بے رحمی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ بیوہ عورتوں کو زندہ جلا دیا جاتا مُردوں کو دفن کرنے کے بجائے باہر پھنکوا دیتے جنہیں چیل کوّے نوچ نوچ کر کھاتے۔ متعدد دیوی دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی۔ ایرانیوں کے اثر سے آگ کی پوجا اور بہت سے بے جا مراسم چل پڑے تھے۔ ظلم و ستم، خانہ جنگی، اور بد اخلاقی عام

ہوگئی تھی چنانچہ سکندر یونانی عذاب کی طرح نازل ہوا، اور ان کی عبرت کے لیے انتہائی دردناک مناظر پیش کیے۔ ایران فتح کرنے کے بعد سکندر نے ان صوبوں کا اس وجہ سے رُخ کیا کہ وہ انہیں ایرانی حکومت کا حصہ سمجھتا تھا اور انہیں مطیع و باج گذار بنانا چاہتا تھا۔

سکندر یونان کا رہنے والا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ سے ۳۵۵ سال قبل پیدا ہوا۔ اس کا باپ فِلپ مقدونیہ کا بادشاہ تھا۔ سکندر کو بچپن ہی سے ملک گیری کا بہت شوق تھا۔ وہ ساری دنیا کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا کرتا تھا۔ اس کا باپ فلپ جب کوئی نیا ملک فتح کرتا، تو وہ نہایت حسرت سے کہا کرتا "معلوم ہوتا ہے میرے والد سارے ممالک خود ہی فتح کرلیں گے اور میری قوت آزمائی کے لیے کچھ نہ چھوڑیں گے۔"

سکندر ابھی لڑکا تھا یہی کوئی تیرہ چودہ سال کا کہ ایک سوداگر گھوڑے فروخت کرنے لایا۔ سوداگر کے پاس ایک بہت ہی خوبصورت گھوڑا تھا مگر وہ انسانی سائے سے بدکتا اور اپنی پیٹھ پر کسی کو سوار نہ ہونے دیتا۔ سکندر کو وہ گھوڑا بہت پسند تھا مگر اس عیب کی وجہ سے فلپ اسے خریدنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ سکندر نے جب امیدوں پر پانی پھرتے دیکھا تو سواری کے لیے خود کو پیش کردیا۔ درباری منع کرتے رہے مگر فلپ نے اجازت دیدی۔ سکندر نے بڑی چالاکی سے کام لیا۔ گھوڑے کے قریب ایسی سمت سے گیا کہ گھوڑا اس کا سایہ نہ دیکھ سکا اور جلدی سے پشت پر سوار ہوکر دوڑانے لگا۔ جب گھوڑا تھک کر بے حال ہوگیا، تب اسے واپس لایا۔ لوگ اس لڑکے کی ہمت اور چالاکی دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ اس گھوڑے کو سکندر بہت عزیز رکھتا تھا۔ اپنے ساتھ ہندوستان بھی لایا تھا۔ یہیں وہ گھوڑا مرا، چنانچہ اسے جہلم کے قریب دفن کرکے سکندر نے اس کی

یادگار میں ایک شہر آباد کیا تھا جس کے کھنڈرات اب برآمد ہوئے ہیں۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، کہتے ہیں کہ سکندر ابھی بارہ سال کا تھا کہ شاہ فارس کے سفیر مقدونیہ پہنچے۔ فلپ موجود نہ تھا۔ چنانچہ سکندر نے ان سے ملاقات کی اور ان سے بچپنے کی باتیں کرنے کے بجائے ایسی باتیں کیں کہ وہ لوگ حیران رہ گئے۔ پوچھا فارس میں بڑے شہر کون سے ہیں؛ کتنے فاصلے پر واقع ہیں؟ سڑکوں کا کیا حال ہے؛ بادشاہ کے عادات و اطوار کیسے ہیں؛ دشمنوں سے کس طرح پیش آتا ہے؛ اس کی قوت و شوکت کن چیزوں پر منحصر ہے؛ وغیرہ اسی طرح جب سولہ سال کا ہوا تو مقدونیہ میں اسے اپنا جانشین بنا کر فلپ ایک مہم میں شریک ہونے کے لیے باہر چلا گیا۔ بادشاہ کی عدم موجودگی میں اس نے سلطنت کا بہترین انتظام کیا۔ کچھ لوگوں نے بغاوت کی تو اس نے بہت ہی خوبی کے ساتھ فرد کر دیا۔

دنیا کا مشہور فلسفی، ارسطو، اس کا استاد تھا۔ سکندر اس کی بڑی قدر کرتا اور ہر معاملے میں اس سے ضرور مشورہ کرتا۔

حکومت کا سارا بار اس کے سر آ پڑا۔ بہت سے لوگوں نے اسے لڑکا سمجھ کر بغاوت کر دی۔ مشیروں نے باغیوں کی کثرت دیکھ کر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینے کا مشورہ دیا، مگر سکندر نے ایک نہ سُنی۔ بولا "اگر ایک علاقے میں بھی ڈھیل دی گئی اور میں دست بردار ہوا تو رفتہ رفتہ سارا ملک ہاتھ سے نکل جائے گا" اور پھر باغیوں کی سرکوبی بڑی جواں مردی سے کی اور چند ہی دنوں میں سب کو قابو میں کر لیا۔

مقدونیہ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ساری دنیا فتح کرنے کے منصوبے سے نکل پڑا۔ پہلے ایران فتح کیا اور پھر کابل فتح کرتا ہوا ۳۲۷ سنہ ق م میں درّہ خیبر کی راہ ہمارے ملک میں داخل ہو گیا۔ سرحد پر بعض لوگوں سے کچھ جھڑپیں ہوئیں،

سکندر کا حملہ
واپسی کا راستہ
بحیرہ اسود
بحیرہ کیسپین
بحیرہ روم
دریائے نیل
مصر
عرب
فرات
دجلہ
بابل
فارس
خلیج فارس
بحیرہ عرب
ہندوستان
ٹیکسلا
پورس
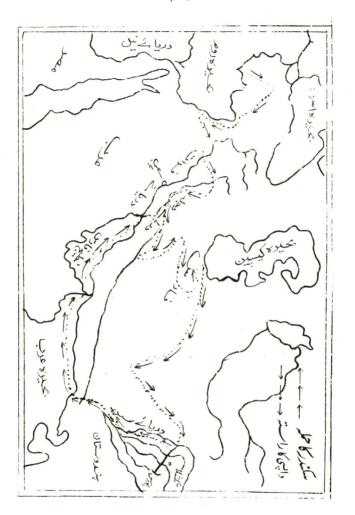
مگر عام طور پر سب مطیع ہو گئے۔ ٹکشیلا کے راجہ نے تو ملک میں داخل ہونے سے قبل ہی اطاعت قبول کر لی تھی اور فوج کی ضیافت کے لیے کئی ہزار بچھڑے تیار کر رکھے تھے۔ یونانی سپاہی وہاں پہنچ کر کئی ہفتے مزے سے دعوتیں اڑاتے رہے اور جب تازہ دم ہو چکے تو پھر اسی راجہ کی مدد سے دریائے جہلم پار کر کے راجہ پورس پر چڑھائی کی۔ پورس نے نہایت پامردی سے مقابلہ کرنا چاہا، مگر برادرانِ وطن کی غدّاری اور سکندر کی جنگی چالوں کے سامنے اس کی ایک پیش نہ گئی۔ اس کے جنگی ہاتھی زخمی ہو کر بھاگے اور اپنی ہی پیدل فوج کو جو پیچھے تھی کچل کر رکھ دیا۔ پورس زخموں سے چور سکندر کے رُو برُو پیش کیا گیا۔ سکندر نے پوچھا "تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے"؟

پورس نے نہایت بے باکی سے کہا "جو ایک راجہ دوسرے راجہ کے ساتھ کیا کرتا ہے۔"

سکندر اس جواب سے بہت خوش ہوا نہایت عزّت سے پیش آیا اور اس کا راج اُسے واپس کر دیا۔

اب سکندر نے آگے بڑھ کر مگدھ دیش پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کی۔ مگدھ اس وقت بھارت کی سب سے وسیع اور طاقتور سلطنت تھی۔ پنجاب، کشمیر اور سندھ کے علاوہ باقی شمالی ہند اس میں شامل تھا۔ نند خاندان کے راجہ یہاں راج کرتے تھے۔ اس خاندان کے ایک باغی شہزادہ چندر گپت نے بھی سکندر سے مل کر اس کو مگدھ پر چڑھائی کی دعوت دی تھی۔ غرض سکندر کو بھارت کے کئی راجاؤں کی حمایت حاصل ہو چکی تھی اور اس نے حملے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا، مگر اس کی فوج اب کافی تھک چکی تھی۔ شمالی ہند کی گرمی بھی انہیں پریشان کر رہی تھی۔ دوسرے مگدھ کی طاقت سے بھی کچھ سہمے ہوئے تھے، گھر الگ یاد آ رہا تھا۔

اس لیے ان لوگوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً سکندر کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا واپسی کے لیے اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ کئی سو کشتیاں تیار کر کے جہلم اور سندھ کی راہ سمندر تک پہنچا۔ راستے میں کئی چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستیں ملیں اُن سے مڈبھیڑ ہوئی۔ یونانیوں نے نہایت بے دردی سے وہاں کے باشندوں کا قتلِ عام کیا۔ خود انہیں کے قول کے مطابق ان مہموں میں اسّی ہزار سے زیادہ قتل ہوئے اور متعدد مرد عورتیں غلام بنا کر بیچ دیے گئے۔ سندھ کے دہانے پر پہنچ کر سکندر نے کچھ سرداروں کو بحری راستے سے بھیجا اور خود خشکی کی راہ بلوچستان ہوتا ہوا ایران روانہ ہوا مگر اتفاق سے مکران کے ریگستان میں پھنس گیا۔ جہاں گرمی کی شدت اور کھانے پینے کی قلت کے باعث متعدّد جانیں ضائع ہوئیں اور لوٹ کا سارا سامان اسی ریگستان کی بھینٹ چڑھ گیا۔ بڑی مشکلوں سے ۳۲۴ ق م میں ایران ہوتا ہوا بابل پہنچا۔ وہاں ایک تقریب میں کثرت سے شراب پی جس کے باعث اسے شدّت کا بخار چڑھا اور ۳۳ سال کی عمر میں دُنیا سے کوچ کر گیا۔

۱۔ سکندر کون تھا؟ اس کے بچپن کے حالات بیان کرو۔

۲۔ راجہ پورس سے سکندر کی کیا بات چیت ہوئی؟

۳۔ سکندر پنجاب ہی سے کیوں لوٹ گیا؟

۴۔ پنجاب اور سندھ پر اس کے حملے اور اس کے نتائج پر روشنی ڈالو۔

۵۔ سکندر کس طرح واپس ہوا؟ اس کی موت کیوں کر ہوئی؟

باب ۹

مبلّغ راجا اشوک

سکندر عذاب کی طرح آیا، مگر صرف پنجاب اور سندھ کو تاراج کرتا ہوا واپس لوٹ گیا۔ مگدھ (شمالی ہند) پر حملہ آور ہونے میں وہ چندر گپت کی بھی مدد نہ کر سکا جس سے مایوس ہو کر چندر گپت نے چانکیہ عرف کوٹلیا سے مدد لی اور نند خاندان کو تباہ کر کے خود مگدھ کے راج پر قبضہ کر لیا اور اپنی ماں مورا کے نام پر جو ایک شودر کی لڑکی تھی، موریہ خاندان کی بنیاد ڈال دی۔ اسی خاندان میں ایک مشہور راجہ اشوک ہوا ہے۔ یہ چندر گپت موریہ کا پوتا تھا۔ سنہ ۲۷۲ ق م میں گدی پر بیٹھا لیکن اس سے قبل اسے تخت کے لیے اپنے بھائیوں سے کئی سال مسلسل جنگ کرنی پڑی۔ کہتے ہیں وہ شروع میں بدھ مت کا بہت ہی مخالف، برہمنی مت کا پیرو اور نہایت ظالم راجہ تھا۔ بدھ مت کے مبلّغوں کو قتل کرانے میں اسے بہت ہی لطف آتا تھا۔ چنانچہ عرفِ عام میں وہ "دُشٹ اشوک" کے لقب سے مشہور ہو گیا تھا۔ اُسے ملک گیری کا بھی بہت شوق تھا۔ سنہ ۲۶۱ ق م میں اس نے جنوبی ہند کی مشہور ریاست کلنگ پر چڑھائی کی۔ جنگ میں زبردست کُشت و خون ہوا۔ ایک لاکھ آدمی مارے گئے، اور ڈیڑھ لاکھ قیدی ہوئے۔ اشوک کامیاب تو ہو گیا، مگر جنگ کے دردناک مناظر نے اس کی کایا پلٹ دی۔

اس نے جنگ سے توبہ کی، بُدھ مت قبول کیا (۲۵۵ق م) اور اپنی بقیہ زندگی اس مت کی تبلیغ و اشاعت اور خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دی۔ اب وہی "دُشٹ اشوک" اپنی خوبیوں کے باعث "دھرما تما اشوک" کہا جانے لگا۔ اشوک نے اعلان کیا:-

"رعایا کی خدمت میرا فرض ہے۔ میری زندگی کام کے لیے ہے۔ مجھ سے پہلے بھی اکثر فرماں رواؤں نے رعایا کو آرام پہنچایا ہے، لیکن میری جدوجہد کا مقصد یہ ہے کہ لوگ پرہیزگاری کے قانون پر عمل کریں۔"

اس نے سلطنت کے سارے وسائل و ذرائع اسی مقصد کی تکمیل پر لگا دیے۔ جگہ جگہ چٹانوں اور پتھر کی لاٹھوں پر اخلاق کے پاکیزہ اصول نہایت عام فہم زبان میں کندہ کرائے جن میں بہت سے اب تک موجود ہیں۔ تم نے بھارت کے موجودہ سکّوں پر جڑواں شیروں کی تصویر یا جھنڈے پر چکّر بنا ہوا دیکھا ہوگا۔ یہ دونوں چیزیں اشوک کی لاٹھ ہی کی یادگار ہیں۔ لاٹھوں اور سِلوں پر عام طور پر جو باتیں کندہ کرائی گئی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے:۔

ا۔ کسی جاندار کو تکلیف نہ دی جائے۔

ب۔ والدین، اُستادوں اور بزرگوں کی عزّت کی جائے۔

ج۔ ہر معاملے میں راست بازی و دیانت داری پیشِ نظر رہے۔

د۔ غریبوں، محتاجوں اور بے کسوں کی مدد کی جائے۔

ہ۔ عام لوگوں، خاص کر ماتحتوں، ملازموں اور غلاموں کے ساتھ محبّت اور ہمدردی کا سلوک کیا جائے۔

ان اصولوں پر عمل کرانے کے لیے اس نے بہت کوششیں کیں، فقیروں کا بھیس بنا کر مختلف مقامات پر گیا اور ان کا پرچار کیا۔ سلطنت کے کونے کونے

ہندوستان
(اشوک کے دور میں) کتبے (چٹانوں اور ستونوں پر)
گاندھار
شہزادگڑھی
کابل
جہلم
راوی
دریائے سندھ
اندر پرست
دریائے برہم پتر
دریائے چمبل
پریاگ
بودھ گیا
سانچی
گرنار
نربدا
تاپتی
ناسک
گوداوری
کلنگ
کرشنا
بحیرہ
عرب
خلیج
بنگال
لنکا
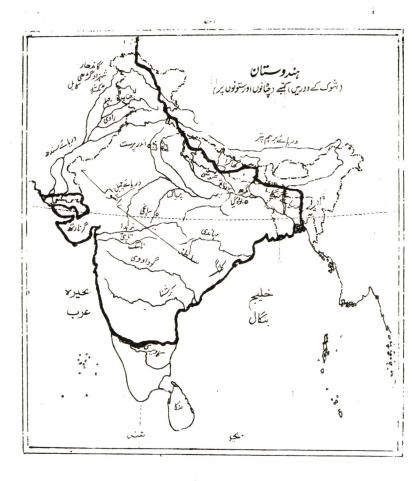
ہیں خانقاہیں اور مدرسے قائم کیے جہاں ان پاکیزہ اصولوں کی عملی تربیت ہوتی۔ سرکاری ملازمین کو حکم دیا کہ وہ خود ان اصولوں پر کاربند رہیں اور جگہ جگہ جلسے کرکے عوام کو ان سے باخبر کریں۔ رعایا کو پاکیزہ زندگی پر آمادہ کرنے اور برائیوں سے باز رکھنے کے لیے اس نے ایک بہت بڑا محکمہ قائم کیا۔ بہت سے ایسے میلے ٹھیلے، یا تفریح کے اڈے اس نے بند کرا دیے، جن کے ذریعے شراب خوری اور بے حیائی پھیلتی، یا جہاں انسانوں یا جانوروں کو پریشان کرکے لطف لیا جاتا۔ اس نے اپنے دور کے مشہور بُدھ عالموں کا ایک اجتماع منعقد کیا، جس کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ عالموں کے باہمی اختلافات جس سے بُدھ مت کی اشاعت میں بڑی رکاوٹ پڑ رہی تھی، دور ہو گئے۔ دوسرے سب نے سر جوڑ کر اس مت کی ترقی اور اشاعت کے لیے ایک خاکہ مرتب کیا۔ اس سے قبل علماء کے دو اور اجتماعات بھی منعقد ہو چکے تھے۔ ایک بُدھ کی وفات کے چند ہی دن بعد اجات شترو کے دَور میں دوسرا اس سے سو سال بعد، مگر ان اجتماعات میں علماء کے اختلافات دور ہونے کے بجائے بڑھتے ہی گئے تھے۔ البتّہ یہ اجتماع اس لحاظ سے بہت کامیاب رہا۔

ان تمام کوششوں کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ اشوک کے دور میں ہندوستانیوں کی عام اخلاقی حالت سنور گئی۔ کیوں نہ ہو حکومت کے وسائل و ذرائع بھی تو بڑی قوت رکھتے ہیں۔ رہا اس قوت کا بُرے یا بھلے کاموں پر صرف کرنا تو یہ حکومتوں کے ظرف پر منحصر ہے۔ بھارت کی موجودہ سرکار نے بھی اشوک کا دھرم چکر بطورِ علامت اختیار کیا ہے۔ خدا کرے موجودہ دَور کی اخلاقی خرابیاں دور کرنے اور نیکیاں پھیلانے کی اسے توفیق نصیب ہو۔

اشوک کی جدوجہد صرف ہندوستان تک محدود نہ رہی، بلکہ اس نے

اپنے بیٹے بیٹی، اعزّہ واقارب اور متعدّد مبلغوں کو دوسرے ممالک بھیج کر بدھ مت کی تبلیغ اور نیکیوں کی تلقین کرائی۔ لنکا، ملایا، برما، نیپال، تبت، چین، افغانستان وغیرہ دور دراز ممالک کے لوگوں میں بدھ مت کا پرچار کرایا اور آج جب کہ اپنی جائے پیدائش بھارت میں اس مت کے پیرو خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں اُن ملکوں میں اب بھی اس مت سے اپنے کو منسوب کرنے والوں کی تعداد کئی کروڑ تک پہنچتی ہے۔

۱۔ موریہ خاندان کی داغ بیل کیوں کر پڑی؟

۲۔ اشوک کس طرح بُدھ مت کا پیرو بن گیا؟ اس نے بُدھ مت کی کیا خدمات انجام دیں؟

۳۔ بھارت کی موجودہ سرکار نے اشوک کی یادگار کے طور پر کیا کیا اپنایا ہے؟

۴۔ لاٹھوں پر اشوک نے کیا کندہ کرایا تھا؟

باب ۱۰

کنشک اور بدھ مت کا زوال

اشوک کی وفات اور اُس کے تین سو سال بعد تک کے حالات تاریکی میں ہیں۔ غالبًا یہ پورا دور انتہائی انتشار اور افراتفری کا تھا۔ اشوک کے بعد ایک فرماں روا بھی ایسا نہ ہوا جو اس کی وسیع سلطنت کو سنبھالتا اور ملک کا شیرازہ بکھرنے سے بچا سکتا۔ یہی دور تھا جب کہ بیت المقدس میں حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے۔ عیسیٰؑ کا ایک نام لیوا سینٹ پال غالبًا ہندوستان آیا۔ لیکن اس کی تبلیغ راس کماری کے قرب وجوار میں ہی محدود رہ گئی اور ہندوستان پر حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کا اثر بالکل ناپید رہا۔ باہر کی کئی قوموں نے پے در پے حملے کیے اور لوٹ مار، غارت گری کے بعد جگہ جگہ اپنی ریاستیں قائم کیں۔ ان میں یونانی، شاک پہلوی، یوچی اور کشن مشہور ہیں۔ مگدھ کی حکومت کے بعض حصوں پر شنگ خاندان کے راجہ قابض ہو گئے تھے جو برہمنی مت کے ماننے والے تھے۔ جنوبی ہند میں ست واہن خاندان بعض حصوں پر قابض تھا اور راجپوتانہ وغیرہ میں شاک خاندان کے چھترپ راج کرتے تھے۔ اسی انتشار کے دور میں کشن خاندان کے مشہور راجہ کنشک نے ایک وسیع سلطنت قائم کی۔ کنشک ۷۸ء اور بعض تخمینوں کے مطابق ۱۲۰ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کی سلطنت جتنی شمالی ہندوستان میں

پھیلی ہوئی تھی اتنی ہی ہندوستان کے باہر افغانستان وغیرہ میں تھی۔ چنانچہ پرشپور (موجودہ پشاور) کو اس نے راج دھانی بنایا تھا۔ یہ راجہ کہنے کو تو بدھ مت کا پیرو تھا، مگر اکبر کی طرح مذہب کے معاملے میں انتہائی بے اصولا تھا۔ یونانی دیوی دیوتاؤں کو بھی پوجتا، ایرانیوں کی نقل میں آگ کی بھی پرستش کرتا گوتم بُدھ کے مجسّمے کو بھی پوجتا اور برہمنی مت کے دیوی دیوتاؤں کی عبادت بھی کرتا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بُدھ مت کی اس نے بڑی سیوا کی، لوگوں کو بُدھ کی مورتی پوجنے پر آمادہ کیا۔ بدھ مت کے عالموں کا ایک بہت بڑا اجتماع کیا اور اس مت کے اصولوں میں لچک پیدا کر کے دوسرے مذاہب کے بہت سے اصول اور رسوم اس میں شامل کیے۔ پتھر ترشوا کر گوتم بدھ کے متعدد قد آدم بُت بنوائے، جو پاکستان کے بعض عجائب خانوں میں اب تک پائے جاتے ہیں۔ مگر غور کرو تو محسوس ہوگا کہ ایسا کر کے اُس نے بدھ مت کی سیوا نہیں کی بلکہ اس کی روح نکال کر اسے فنا کر دیا۔ اب بُدھ مت کے پیرؤں کو اپنے مت کے بنیادی اصولوں سے لگاؤ نہیں رہا بلکہ گوتم بُدھ کی مورتی بنا کر کبھی اس پر عقیدت کے پھول چڑھا دینا، یا اس کی پرستش کر لینا، لے دے کر بس یہی رہ گیا۔ گوتم بدھ کے پیش کردہ اخلاقی اصولوں پر خود عمل کرنے، یا دوسروں کو اس پر عمل کے لیے ابھارنے کا وہ پہلا سا جوش و خروش نہ رہا۔ برہمنی مت جس کی کمزوریوں اور رسمی باتوں کی اصلاح کے لیے اس مذہب نے جنم لیا تھا اسی کے اصول اپنے یہاں داخل کر لیے۔ رحم دلی کا ایسا غلط مفہوم لیا جانے لگا کہ ظالم حملہ آوروں سے اپنے حق کے لیے لڑنا اور مجرموں کو معقول سزا دینا بھی جُرم شمار ہونے لگا۔ چنانچہ برے لوگ اُبھر کر سامنے آنے لگے، اور بداخلاقیوں کا پھر زور ہونے لگا۔ سماج

کی اخلاقی خرابیاں دور کرنے کے بجائے اس مت کے پیرو دنیا سے بے تعلق ہو کر سادھو سنتوں کی سی زندگی گزارنے اور ظالموں کی بھیک پر بسر اوقات کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس مت کی ساری دل کشی ختم ہو گئی۔ بُدھ اب ایک دیوتا یا بھگوان کے اوتار بن گئے اور ان کی تعلیم صرف جانوروں پر رحم کھانے تک محدود رہی۔ اِن دونوں باتوں کو برہمنوں نے اپنے مت میں داخل کر لیا۔ چنانچہ اب اس مت کے علیحدہ وجود کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی اور کنشک کو مرے ہوئے دو سو سال بھی نہیں گذرے تھے کہ اس مت کا خود اپنی جنم بھومی میں جنازہ نکل گیا اور اس کی جگہ برہمنی مَت پھر سارے بھارت پر چھا گیا۔

۱۔ اشوک کی وفات کے بعد ہندوستان کی کیا حالت ہوئی؟ کیوں؟

۲۔ کِنشک کون تھا؟ اس نے اپنی راج دھانی کہاں قائم کی تھی؟

۳۔ کِنشک کے عقائد کیا تھے؟ اس نے بُدھ مت میں کمی بیشی کی کس طرح کوشش کی؟ اس کی ان کوششوں کا کیا نتیجہ ہوا؟

۴۔ بدھ مت کی جنم بھومی میں اس مت کے ماننے والے کیوں نہیں رہے؟

بکرمادتیہ اور برہمنی مَت کا احیاء

برہمنی مت اور سنسکرت زبان کو پھر سے زندہ کرنے اور ترقی دینے والوں میں پیش پیش گپت خاندان کے راجہ رہے۔ اس خاندان کا بانی چندرگپت ہوا ہے جس نے ۳۱۹ء میں پاٹلی پتر کے تخت پر قبضہ کرکے حکومت شروع کی۔ اس کے حالاتِ زندگی تاریکی میں ہیں۔ اس کے مرنے پر اس کا بیٹا سمُدرگپت تخت نشین ہوا۔ اس راجہ کی شان میں اس کے درباری شاعر نے ایک قصیدہ لکھا تھا، جو الٰہ آباد میں اشوک کی لاٹھ کی پشت پر کندہ ہے۔ اس میں اگرچہ بہت مبالغے سے کام لیا گیا ہے مگر اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سمدرگپت کو ملک گیری کا بڑا شوق تھا۔ اس نے شمالی ہند کے بہت سے ممالک فتح کرکے اشومیدھ یگیہ کیا تھا اور برہمنوں کو بہت سی گائیں اور سونے کے سکّے انعام میں دیے تھے۔ اس نے برہمنوں کی عزت افزائی اور برہمنی مت کو ترقی دینے کی بڑی کوشش کی تھی۔

اس خاندان کا سب سے مشہور راجہ سمدرگپت کا بیٹا بکرمادتیہ ہوا ہے۔ اس کے عدل و انصاف اور حُسنِ انتظام کے متعدد قصّے عوام میں مشہور ہیں۔ خاص کر سنگھاسن بتیسی کے بتیسوں قصے تو بے حد دلچسپ ہیں۔ یہ قصّے اگرچہ بناوٹی ہیں، لیکن ان سے ایک بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ راجہ بلاشبہ بہت ہی انصاف پسند رہا ہوگا، ورنہ اتنے قصّے اس کی طرف کیوں منسوب ہوتے۔

اس کے دور میں فاہیان نامی ایک چینی سیّاح ہندوستان آیا۔ وہ بُدھ مت کا پیرو تھا۔ اس نے اس غرض سے اتنا طویل سفر اختیار کیا تھا کہ بُدھ مت

کی تعلیمات کو اصل کتابوں سے معلوم کر کے محفوظ کر لے اور اس مت کے مقدس مقامات کی زیارت کرے۔ اس نے ہندوستان کے تقریباً تمام مشہور مقامات کی سیاحت کی اور اپنا سفرنامہ مرتب کر گیا جس سے اس دور کی تاریخ مرتب کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس نے بکرما دتیہ اور اس دور کے انتظامات کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "راجہ کا جسم بہت ہی سڈول اور قوی تھا وہ گراں ڈیل اور بہادر نیز شکار کا شوقین تھا۔ اس کے دور میں ملک کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔ لوگ عموماً فارغ البال تھے۔ چوری ڈاکے پر ہاتھ کاٹ دیے جاتے تھے۔ چنانچہ اس طرح کے اخلاقی جرائم بہت کم ہو گئے تھے۔ بیماروں کا علاج کرنے کے لیے جگہ جگہ اسپتال قائم تھے۔ عدل و انصاف کا بہت معقول انتظام تھا۔ افسران کی باقاعدہ نگرانی ہوتی۔ چنانچہ وہ رعایا کو پریشان کرنے کا موقع نہ پاتے تھے۔ جانوروں کے ساتھ مہربانی کا سلوک ہوتا تھا۔"

بکرما دتیہ خود علم دوست آدمی تھا۔ اس کے دور میں علوم و فنون کی بڑی ترقی ہوئی۔ سنسکرت کے زبردست عالم اس کے دربار میں رہتے، جن کی مالی امداد اور عزت افزائی کی جاتی۔ سنسکرت کا مشہور عالم اور ہندوستان کا نامی شاعر کالی داس اسی کا درباری شاعر تھا۔ بکرما دتیہ اسے بہت محبوب رکھتا تھا۔

اسی کالی داس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ پہلے بالکل ان پڑھ اور دیہاتی گنوار تھا۔ ایک دن پیڑ کی ایک شاخ پر بیٹھا اسی شاخ کو کاٹ رہا تھا۔ کچھ پنڈتوں کا ادھر سے گذر ہوا۔ ان پنڈتوں کو ایک عالم عورت مذہبی مباحثے میں پچھاڑ چکی تھی۔ ان لوگوں نے اس عورت سے بدلہ لینے کی ٹھانی، چنانچہ اسی مورکھ کو پکڑ لے گئے اور اسے بہت بڑا عالم بنا کر دھوکے سے شادی کرا دی، مگر جب اس عورت کو معلوم ہوا کہ یہ تو نرا جاہل ہے تو اس نے گھر سے نکال دیا۔ کالی داس کو بہت

غیرت آئی۔ گھر سے نکل کھڑا ہوا اور کئی سال محنت کر کے خوب تعلیم حاصل کی یہاں تک کہ مہا پنڈت بن گیا۔ پھر اپنی لیاقت کی بنا پر بکرما دتیہ کے دربار میں اس کی رسائی ہوئی اور رفتہ رفتہ وہ راجہ کی آنکھوں کا تارا ہو گیا۔

بکرما دتیہ کے دربار میں اور بھی کئی زبردست عالم تھے، جو اس کے دربار کے رتن کہلاتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے فن کا ماہر تھا۔ چنانچہ علوم و فنون کی بڑی ترقی ہوئی۔ برہمنی مت کو بھی نئے سرے سے عروج حاصل ہوا۔ اسی لیے تو بہت سے لوگ اس کے دَور کو تاریخ ہند کا ''سنہری زمانہ'' کہتے ہیں۔

۱۔ برہمنی مت کے دوبارہ عروج کے کیا اسباب ہوئے؟

۲۔ گپت خاندان کے راجاؤں نے اِس مت کی ترقی کے لیے کیا کوششیں کیں؟

۳۔ بکرما دتیہ کون تھا؟ اس کے بارے میں فاہیان نے کیا لکھا ہے؟

۴۔ بکرما دتیہ نے علم و ادب کی کس طرح خدمت کی؟

۵۔ کالی داس کون تھا؟ یہ کس طرح راجہ کی آنکھوں کا تارا بن گیا؟

باب ۱۱

ہرش وردھن

بُدھ مت کے بھکشوؤں کے مقابلے میں برہمنی مت کے علمبرداروں نے اپنی بہت سی کمزوریاں دور کر کے ملکی انتظام کے لیے اپنے کو اللہ کی نگاہ میں اہل تر ثابت کر دیا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے انہیں پھر ایک موقع دیا اور اس میں شک نہیں کہ گپت خاندان والوں کی سرکردگی میں ایک مدت تک ان لوگوں نے بہت سے بناؤ کے کام کیے مگر اقتدار کے نشے اور راجاؤں کی غیر معمولی نوازشوں نے ان میں پھر وہی کمزوریاں اُبھار دیں۔ ذات پات اور چھوت چھات کا زور بڑھا۔ بھارتی سماج کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ ایسے قوانین گھڑے گئے جن کی رو سے بہت سے طبقے بن گئے۔ ان طبقوں کے مفاد آپس میں ٹکراتے تھے۔ ہر طبقے کا فرد دوسرے طبقے کے افراد کو اپنے سے کم تر سمجھتا تھا۔ شودروں کو آبادی میں عام لوگوں کے ساتھ رہنے تک کی اجازت نہ تھی، بلکہ وہ آبادیوں سے باہر رکھے جاتے تھے۔ عالم لوگ علم کے خزانے پر سانپ بن کر بیٹھ گئے تھے اور یہاں کی بہت بڑی آبادی کو علم کی دولت اور عزت کے مقام سے ان لوگوں نے محروم کر دیا تھا۔ بہت سے علوم و فنون اور مختلف مذہبی و اخلاقی کتابیں عام لوگوں کو پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہالت کی وجہ سے توہمات پھر بڑھے۔ لوگوں میں

اعلیٰ اخلاق مفقود ہونے لگے۔ شادی بیاہ کے قوانین سخت ہو گئے۔ ہستی زور پکڑنے لگی، بیواؤں کی شادی روک دی گئی، اور بچپن کی شادی کا رواج ہونے لگا۔ راجہ غیر محدود اختیارات کے مالک سمجھے جانے لگے۔ خدا کے اوتاروں کا مسئلہ تسلیم کر لیا گیا۔ سماج کے مختلف گروہوں کے دل ایک دوسرے سے پھٹ گئے ان میں کسی مشترکہ جدوجہد کی صلاحیت باقی نہ رہی۔ بالآخر بیرونی قومیں پھر ٹڈی دل کی طرح ان پر ٹوٹ پڑیں اور بکرمادتیہ کے آنکھ بند کرتے ہی وہ افراتفری مچی کہ بھارت کو دو ڈھائی سو سال تک پھر امن وچین نصیب نہ ہوا۔ ان باہر سے آنے والوں میں ہن لوگ خاص تھے جنہوں نے نہ صرف گپت خاندان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی بلکہ پے در پے متعدد حملے کر کے جگہ جگہ خون کی ندیاں بہا دیں۔ آخر میں ہرش وردھن ایک وسیع سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوا، جب جا کر لوگوں کو کچھ عرصے کے لیے چین نصیب ہوا۔

ہرش تھانیسر کے راجہ پربھاکر وردھن کا بیٹا تھا۔ باپ کے مرنے پر اس کا بڑا بھائی راج وردھن گدی پر بیٹھا۔ ان کی ایک بہن راجیشری تھی۔ یہ دونوں اس سے بہت پیار کرتے۔ راجیشری کی شادی قنوج کے راجہ گرہ ورمن سے ہوئی تھی مگر اس کو مالوہ کے راجہ نے قتل کر کے راجیشری کو اپنی حراست میں لے لیا تھا۔ راج وردھن نے اپنی بہن کو قید سے چھڑانے کے لیے مالوہ پر فوج کشی کی۔ جنگ میں مالوہ کا راجہ ہار گیا، مگر اس کے ایک حلیف نے دھوکے سے راج وردھن کو قتل کر دیا۔ بڑے بھائی کے مرنے پر ہرش وردھن نے ۶۰۶ء میں تھانیسر کی راج گدی سنبھالی۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی بہن کو ڈھونڈھنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ راجیشری مالوہ کے راجہ سے چھٹکارا حاصل کر کے وندھیاچل کی پہاڑیوں کی طرف نکل گئی تھی۔ بڑی مشکل سے اسے

ڈھونڈھ نکالا اور لے کر تھانیسر لوٹا۔

ہرش وردھن کو ملک گیری کا بڑا شوق تھا۔ اس نے چند ہی دنوں میں فوج کشی کر کے آسام سے سندھ تک اور ہمالہ سے نربدا تک اپنی سلطنت کو وسیع کر لیا جنوبی ہند کو بھی وہ اپنی مملکت میں شامل کرنا چاہتا تھا، مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

ہرش کے دَور میں بُدھ مت اپنی تمام خصوصیات کھو کر پورے طور پر برہمنی مت میں ضم ہو چکا تھا۔ چنانچہ گوتم بُدھ کو بھگوان کا اوتار تسلیم کر لیا گیا۔ مخلوط کلچر کے علمبرداروں نے گوشت خوری اور جانوروں کو مارنا بھی ممنوع قرار دیا۔ ہرش اسی مذہب کا روح رواں بنا۔ وہ سورج اور شیو کے ساتھ بُدھ کی بھی پوجا کرتا تھا۔ کنشک اور اکبر کی طرح اس کے دربار میں بھی مختلف مذاہب کے علماء موجود تھے۔ یہ سب کی دل دہی کا خیال رکھنا اور کسی ایک خاص مذہب کی پیروی کے بجائے مختلف مذاہب کی رسوم کا اتباع کرتا۔ ہرش خود بھی سنسکرت کا بہت بڑا عالم اور صاحبِ تصنیف راجہ تھا۔ نظم و نثر دونوں اچھی لکھ لیتا تھا۔ سنسکرت کے تین مشہور ناٹک "رتناولی" "پریہ درشکا" اور "ناگانند" اسی کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ خوشنویسی اور مصوّری میں بھی اس نے کمال حاصل کیا تھا۔ ذیل میں اس کے دستخط دئے جاتے ہیں۔ دیکھیے کتنے خوبصورت ہیں

ہرش کے دستخط

ہرش کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ غریبوں، بے کسوں، برہمنوں اور بھکشوؤں کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ ہر پانچویں سال گنگا جمنا کے سنگم پر ایک مذہبی میلہ لگواتا جس میں ہر مذہب کے لوگ دور دور سے آ کر شریک ہوتے۔ یہ میلہ

مسلسل ۷۵ دن تک چلتا رہتا۔ اس میں ہرش دل کھول کر خیرات کرتا، اور پانچ سال میں جمع کیا ہوا پورا خزانہ خالی کر دیتا یہاں تک کہ چلتے وقت اس کے جسم پر ایک لنگوٹی رہ جاتی، اور پھر اپنی بہن راجیشری سے کپڑے مانگ کر تن ڈھانکتا۔ اسے خیرات کرنے میں بڑا مزہ آتا، وہ اس طرح اپنا خزانہ خالی کر کے بہت خوش ہوتا۔

ہوانگ سانگ

ہرش کے دور میں بھی ایک چینی سیّاح ہوانگ سانگ ہندوستان آیا تھا۔ وہ ۶۳۰ء سے ۶۴۵ء یعنی تقریباً پندرہ سال تک بھارت کے مختلف حصّوں میں گھومتا پھرتا اور بُدھ مت کے مقدس مقامات کی زیارت کرتا رہا۔ اس نے اپنا سفر نامہ بھی مرتب کیا تھا جس سے ہرش کے دورِ حکومت کا حال بہت اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے۔ ہرش کے دور میں بکرما دتیہ کے دور کی طرح اگرچہ راستے محفوظ نہ تھے، چنانچہ خود ہوانگ سانگ کئی بار لٹ گیا تھا پھر بھی رعایا خوش حال تھی۔ جرائم پر سخت سزائیں دی جاتیں۔ پیداوار کا چھٹا حصّہ لگان میں لیا جاتا۔ سرکاری ملازمین کی بدعنوانیوں پر سخت گرفت کی جاتی۔ راجہ خود دورہ کر کے کسانوں کی شکایات سنتا اور اُسے دور کرنے کی کوشش کرتا۔ سڑکیں شفا خانے اور دھرم شالے کافی تھے۔

ہرش وردھن نے آخری عمر میں سنیاس لے لیا تھا اور اسی حال میں وہ ۶۴۷ء میں لاوارث مر گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی ہندوستان میں پھر افراتفری پھیلی۔ پورا ملک چھوٹے چھوٹے متعدد خود مختار ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا جن کے فرمانروا ہمیشہ آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے۔ رعایا باہمی خانہ جنگیوں، لوٹ کھسوٹ اور اونچ نیچ کے جھگڑوں سے تنگ آ چکی تھی۔ ذات پات کی تقسیم نے بھارتی سماج کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا ہر طبقہ زوال کے جس مقام پر تھا، اسی پر مطمئن تھا اور اس کے اندر جو خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، اس کی اصلاح کی کوشش کرنے کے بجائے

اسی پر جمے رہنے پر مصر تھا۔ مل جل کر ملک کا انتظام چلانے کی صلاحیت یہاں کے لوگوں میں ختم ہو چکی تھی۔

ہرش کے دور ہی میں خاتم النبین صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو چکی تھی ، اور آفتاب رسالت سے دنیا کے گوشے گوشے کو منّور ہونا تھا۔ خود ہندوستان کے اس ہمہ گیر بگاڑ کی اصلاح بھی اس صالح پیغام اور کلّی انقلاب ہی سے ہو سکتی تھی، جسے لے کر حضور بھیجے گئے تھے۔ چنانچہ خلفائے راشدین کے دور ہی میں جنوبی ہند کے سوَاحل تک یہ دعوت پہنچی اور پھر دوسرے بزرگوں کی مساعی سے بھارت کے دیگر علاقوں میں پھیلی۔ ان کا حال تم آئندہ اسباق میں پڑھو گے۔

۱۔ کنشک کے بعد ہندوستان کی کیا حالت ہوئی ؟

۲ ہرش کو کس طرح راج گدّی ملی ؟ اس نے گدّی سنبھالتے ہی کیا کام انجام دیا ؟

۳۔ راجیشری کون تھی ؟

۴۔ ہوانگ سانگ کے متعلق تم کیا جانتے ہو ؟ اس کے سفرنامے سے ہرش کے دَور کا کیا حال معلوم ہوتا ہے ؟

۵۔ ہرش میں کیا خصوصیات تھیں ؟

۶۔ مذہب کے معاملے میں ہرش کا کیا رویّہ تھا ؟ عقائد کیا تھے ؟ دین کے معاملے میں یہ رویہ کہاں تک مناسب ہے ؟

۷۔ ہرش کی وفات کے بعد کیا حالات رونما ہوئے ؟ کیوں ؟ اس بگاڑ کی اصلاح میں اسلام نے کس طرح مدد کی ؟

باب ۱۲

مسلمانوں کی آمد

ہندوستان اور عرب کے تجارتی تعلقات بہت قدیم ہیں۔ حضورؐ کی بعثت سے بھی قبل عرب تاجر ہندوستان کے جنوبی مغربی ساحل سے گذر کر لنکا اور جزائر شرق الہند جایا کرتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد ان تاجروں کے پیش نظر صرف تجارت ہی نہیں رہ گئی تھی، بلکہ اسلام کی اشاعت کی طرف بھی وہ خاص توجہ دیتے تھے۔ چنانچہ وہ جہاں کہیں بھی گئے لوگوں کو سچے دین سے روشناس کیا اور تجارت میں ایمانداری اور حسن سلوک سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ لنکا اور مالابار کے ساحلوں پر جگہ جگہ عرب تاجر آباد بھی ہو گئے تھے کیونکہ ان مقامات کے راجاؤں نے انہیں غیر معمولی مراعات دے رکھی تھیں۔ اسی لیے سب سے پہلے انہی ساحلی علاقوں کے باشندے روشناس ہوئے۔

ساحلِ مالابار میں

مسلمان جب پہلے پہل مالابار کے سواحل پر پہنچے ہیں، اس وقت وہاں کے ہندی سماج میں اونچ نیچ، چھوت چھات کا بڑا زور تھا۔ "نائر" اونچی ذات والے شمار ہوتے تھے اور "پوییا" نیچی ذات والے۔ نائر لوگ پوییوں کو نہایت ذلیل سمجھتے تھے اور چھونا تو درکنار، ان کے سائے سے بھی نفرت کرتے۔ پوییے کا سایہ پڑ جانے کے بعد نائر جب تک غسل کر کے کپڑے نہ

بدل لیتا اپنے کو ناپاک سمجھتا تھا۔ وہاں کے راجہ نے قانون بنا رکھا تھا کہ کسی پولیے کا سایہ کسی نائر پر نہ پڑے، ورنہ سخت سزا دی جائے گی۔ چنانچہ پولیے ان نائروں کے ہاتھوں تنگ آ چکے تھے۔ یہ لوگ گھر سے نکلتے تو "پوپو پوپو" آواز لگاتے چلتے تاکہ راستے میں اگر کوئی نائر آ رہا ہو تو وہ ایک طرف ہو جائے اور پولیے کا اس پر سایہ نہ پڑ سکے۔ جنوبی ہند کی عام سماجی حالت بھی بہت ناقص تھی۔ لوگ ان پڑھ اور جاہل تھے، اس لیے مختلف قسم کے توہمات میں گھرے ہوئے تھے۔ بُرے بھلے کی تمیز نہ تھی، بے حیائی عام تھی۔ لوگ برہنہ یا نیم برہنہ رہتے، ایک عورت سے کئی مرد بیک وقت شادی کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ زندگی کا کوئی معقول ضابطہ نہ تھا۔ پرستش کے لیے ایک خدا کی جگہ متعدد دیوی دیوتا گھڑ لیے گئے تھے۔ عرب مبلّغوں اور تاجروں نے انہیں بتایا کہ:۔

"اللہ ایک ہے، اسی نے ساری کائنات بنائی، وہی سب کی ضروریات پوری کرتا ہے، اور جب وہی سب کا خالق، رازق اور پروردگار ہے، تو وہی سب کا مالک حاکم اور بادشاہ بھی ہے۔ ہر انسان اس کا بندہ اور غلام ہے، اللہ نے انسان کو مختلف قسم کی قوتیں، صلاحیتیں اور ساز و سامان عطا کر کے زمین پر اسے اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اصل مالک کی اطاعت اور بندگی کرے اور اس زمین پر اسی کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے۔ اللہ کی مرضی بتانے کے لیے ہر ملک اور قوم میں اس کے رسول آتے رہے ہیں، اللہ کے آخری رسولؐ حضرت محمد مصطفیٰ ہیں آپؐ اس وقت تشریف لائے جب دنیا میں کئی صدی سے کوئی رسول نہ آیا تھا۔ لوگ اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت سے منھ موڑ کر یا اسے بھلا کر غلط راہوں پر پڑ چکے تھے اور اس طرح غلط رُخ پر چل کر اپنے اوپر نیز دوسروں پر ظلم کرتے تھے۔ حضورؐ نے آ کر پھر ان ساری سچائیوں کو تازہ اور مکمل کیا۔ اب قیامت تک سارے انسانوں کی فلاح آپؐ ہی کے

بتائے ہوئے طریقے میں ہے جو لوگ اس ہدایت سے منھ موڑیں گے وہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوں گے اور آخرت میں انہیں انتہائی دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔"

ان لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ" سارے انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ظاہر ہے بھائیوں میں اونچ نیچ اور چھوت چھات کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں تو ایک دوسرے سے محبت اور ہمدردی سے پیش آنا چاہیئے انسان کو ظلم و ستم اور بے حیائی سے بچنا چاہیے۔ اپنی عزت آبرو اور ستر کا لحاظ رکھنا چاہیے۔" ان لوگوں نے یہ ساری باتیں صرف زبانی ہی نہیں بتائیں، بلکہ ان پر عمل کرکے دکھایا۔ چنانچہ پولیوں نے اسلام کی اس سیدھی سادی اور سچی دعوت کو غور سے سنا، اسلام کے سچے نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھے، اس دعوت کو اپنے حق میں ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا اور بہت بڑی تعداد میں مشرف بہ اسلام ہوکر دونوں جہان کی نعمتوں سے متمتع ہوئے۔

انہیں عربوں کی بدولت کچھ سے لے کر ساحل مالابار اور سراندیپ، لکادیپ اور مالدیپ تک کے لوگ متاثر ہوئے۔ ان مقامات کے کئی راجہ بھی مسلمان ہوئے۔ سراندیپ کے ایک راجہ نے توجہ بھی کیا تھا اور دین کی اشاعت کا عزم کرکے لوٹا تھا مگر راستے ہی میں انتقال کرگیا۔

۱۔ اسلام سے پہلے جنوبی ہند کا کیا حال تھا؟

۲۔ ہندوستان میں سب سے پہلے اسلام کس راستے سے آیا؟

۳۔ عرب تاجروں نے مالاباریوں کے سامنے اسلام کی کیا دعوت پیش کی؟ مالاباریوں پر اس کا کیا اثر ہوا؟

۴۔ عربوں کی کوششوں سے جنوب کے اور کون کون سے مقامات اسلام کی روشنی سے منوّر ہوئے؟

سندھ میں اسلام

انہیں ایّام میں جب کہ اسلام کی روشنی سے جنوبی ہند کے سواحل منوّر ہو رہے تھے مسلمان عرب سے پھیلتے پھیلتے ہندوستان کی مغربی سرحدوں تک پھیل چکے تھے۔ پورا ایران اسلام سے مشرف ہو چکا تھا۔ یہیں کے باشندے آگے بڑھ کر ہندوستان میں پہنچنے کی سوچ رہے تھے کہ دو تین اسباب ایسے نکل آئے کہ انہیں ایک موقع ہاتھ آ ہی گیا۔

اسباب

۱۔ پیغمبر اسلام کی وفات کے تیس سال بعد اسلام کی سربراہ کاری بنو اُمیّہ کے پاس چلی گئی اور اسلامی سلطنت کا مرکز دمشق ہو گیا۔ تہتّرویں سال جب کہ اموی خلفاء کو استحکام بھی نصیب ہو گیا اور بحرِ ظلمات سے بحرِ ہند تک کے درمیانی ممالک مسلمانوں کے تحت آگئے تو بنو اُمیّہ کے مخالفین کی ہمتیں پست ہو گئیں اور انہوں نے بغاوت کا مرکز ہند میں منتقل کر دیا۔ سندھ کے مہاراجہ نے باغیوں کو خاص طور پر مدد دینا شروع کیا۔ اس پر اموی سلطنت نے راجہ داہر سے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا، مگر اس نے غالباً ان باغیوں کو واپس دینے سے انکار کر دیا۔

۲۔ انہیں دنوں کچھ عرب کشتیاں سراندیپ (لنکا) سے عراق جا رہی تھیں اتفاق سے سندھ کے ساحل پر دیبل سے قریب بحری قزّاقوں نے انہیں لوٹ لیا۔ مال و اسباب کے ساتھ قزّاق عرب مسافروں کو بھی پکڑ لے گئے۔ ان مسافروں میں بعض عرب عورتیں اور بچے بھی تھے۔ ان لوگوں نے حجّاج کی دہائی دی۔ حجّاج بن یوسف اموی حکومت کی طرف سے عراق کا گورنر تھا۔ اسے جب کشتیوں کے

لٹنے اور مسافروں کو پکڑے جانے کی اطلاع ملی تو اس نے اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک سے دیبل پر حملے کی اجازت لے لی اور راجہ داہر کو لکھا کہ وہ قزاقوں کو سزا دے اور مال و اسباب نیز مسافروں کو برآمد کر کے واپس بھیج دے، مگر جب داہر نے جواب دیا کہ دیبل کے قزاقوں پر اس کا زور نہیں چلتا، تو حجاج نے قزاقوں کی سرکوبی کے لیے ایک مختصر سی فوج بھیجی، جو ہار گئی، اور فوج کا سردار مارا گیا۔ دوبارہ پھر حملہ کرایا تو مقابلے میں راجہ داہر کا بیٹا خود بہت بڑی فوج لے کر آ گیا، اور اس مرتبہ بھی عربوں کو شکست ہوئی۔

محمد بن قاسم کا حملہ

اب حجاج نے بہت بڑے پیمانے پر لشکر کشی کی ٹھانی۔ اس نے اپنے داماد محمد بن قاسم کی سرکردگی میں ایک جرار فوج تمام ساز و سامان سے مسلح بھیجی۔ محمد بن قاسم کی عمر اس وقت صرف سولہ سترہ سال کی تھی۔ یہ تاریخ کا سب سے کم سن فاتح ہے۔ اس نے ۷۱۲ء میں دیبل پر حملہ کیا اور چھ ماہ کے محاصرے کے بعد اسے فتح کر لیا۔ اس کے بعد راجہ داہر سے جنگ ہوئی۔ داہر بھی نہایت جری اور بہادر تھا۔ اس کی فوج بھی ہر قسم کے ساز و سامان سے آراستہ تھی۔ گھمسان کا رن پڑا۔ بالآخر راجہ مارا گیا اور محمد بن قاسم کو فتح نصیب ہوئی۔ آس پاس کے بہت سے راجاؤں نے اطاعت قبول کی اور فوج سے امداد کی۔ سندھ کا انتظام کر کے مسلمان فوجیں آگے بڑھیں۔ برہمن آباد میں داہر کی رانی اور دوسرے خویش و اقارب پناہ گزیں تھے ان سے بھی جنگ ہوئی۔ انہیں مغلوب کر کے محمد بن قاسم نے ملتان پر فوج کشی کی۔ وہ ملتان کو مرکز بنا کر ہندوستانی فوجوں کی مدد سے آگے بڑھنے کا منصوبہ بنا رہا تھا کہ یکایک حجاج کا انتقال ہو گیا۔ اس کے چند ہی ماہ بعد اموی فرماں روا ولید بھی چل بسا اور اس کی جگہ سلیمان نے لی۔ سلیمان کی ولی عہدی میں حجاج

نے رخنے ڈالے تھے اس لیے وہ خلیفہ بن کر حجّاج اور اس کے تمام متعلّقین اور طرفداروں کا مخالف ہوگیا اور اُن سے زبردست انتقام لیا۔ محمد بن قاسم بھی اس کے انتقام کا نشانہ بنا۔ سلیمان نے اُسے معزول کر کے واپس بلایا اور قتل کرادیا۔ اس طرح وہ نوجوان فاتح اپنے تمام منصوبوں کے ساتھ سپردِ خاک ہوگیا۔

اس مہم کے اثرات

اس فاتحانہ مہم کے اغراض ومقاصد خواہ کچھ بھی رہے ہوں، محمد بن قاسم اور اس کے ساتھیوں کے فیاضانہ کردار اور حسنِ سلوک سے سندھ اور آس پاس کے لوگ کافی متاثر ہوئے۔ جاٹوں کی ایک بہت بڑی تعداد انہیں لوگوں کے ذریعے اسلام لائی اور بزرگانِ دین کو بھی سواحل سے آگے بڑھ کر اندرونِ ملک میں اسلام کی تبلیغ کے زیادہ مواقع ہاتھ آئے۔ انہوں نے ملتان کو اپنا مرکز بنایا اور گردونواح میں ایک منظم اسکیم کے تحت دین کی اشاعت شروع کی۔ ان بزرگوں کی کوششوں سے چند ہی دنوں میں سندھ اور پنجاب کا جنوبی حصّہ اسلام کی کرنوں سے منوّر ہوگیا۔ سندھ میں اسلام پھیلانے والوں میں سیّد یوسف الدینؒ اور شہباز قلندرؒ مشہور ہیں اور پنجاب کے ملحقہ حصوں میں زکریاؒ اور شمس تبریزیؒ۔ اللہ ان بزرگوں کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

۱۔ سندھ میں اسلام کس طرح پہنچا؟

۲۔ محمد بن قاسم کے حملے کے کیا اسباب تھے؟

۳۔ محمد بن قاسم کا کیا حشر ہوا؟ کیوں؟

۴۔ اس حملے نے اسلام کے لیے کس طرح راہیں کھول دیں؟ بزرگانِ دین نے اس سے کیونکر فائدہ اٹھایا؟

باب ۱۳

محمود غزنوی کے حملے

اس سے قبل ہندوستان میں اسلام کی روشنی جنوبی مغربی ہند کے ساحلوں کی طرف سے پھیلی تھی لیکن اندرونِ ملک اس روشنی سے تقریباً محروم رہ گیا تھا۔ محمد بن قاسم کی مہمات سے صرف سندھ اور پنجاب کا جنوبی حصہ بہت حد تک متاثر ہو سکا تھا۔ ہندوستان کے دیگر حصوں کو منور کرنے کے لیے اسلام شمال مغرب کی طرف سے داخل ہوا، اور محمود غزنوی کی فتوحات ان حصوں میں مبلغین اسلام کے پہنچنے کا ذریعہ بنیں۔ مسلمانوں کے لشکر کا یہ امیر غزنی کے فرمانروا سبکتگین کا لڑکا تھا۔ سبکتگین ابتدا میں ایک معمولی سردار تھا۔ شکار کر کے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا۔ ایک بار اس نے ایک ہرن کا بچہ پکڑا۔ جب اسے لے کر چلنے لگا تو ہرنی بے چاری ممتا کی ماری اس کے پیچھے ہو لی۔ وہ حسرت سے اپنے بچے کو دیکھتی جاتی تھی۔ سبکتگین نے ترس کھا کر بچے کو چھوڑ دیا۔ مشہور ہے کہ اس واقعہ کے بعد حضورؐ نے اسے خواب میں بشارت دی کہ عنقریب وہ ایک سلطنت کا فرماں روا ہوگا اور ساتھ ہی تلقین کی کہ "حکومت ملنے کے بعد رعایا کے ساتھ اسی طرح رحم دلی کا برتاؤ کرنا اور ہمدردی سے پیش آنا۔" سبکتگین اپنے آقا الپتگین کی وفات کے بعد غزنی کی سلطنت کا مالک ہو گیا۔ اس نے

اپنے بیٹے محمود کی تعلیم و تربیت کا بھی خاص خیال رکھا۔ محمود بچپن ہی سے نہایت جری اور بہادر تھا۔ باپ کے ساتھ جنگوں میں شرکت کرتا۔ سکندر اور نپولین کی طرح وہ بھی ابتدا ہی سے بیش از بیش علاقے فتح کرنے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ باپ کے مرنے پر تخت و تاج کے لیے اسے اپنے چھوٹے بھائی سے جنگ کرنی پڑی۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے ملک گیری شروع کی۔ قوت آزمائی کے لیے اس کے پاس ہندوستان کے باہر ہی کافی میدان تھا اور ابتدا میں اس کی جدوجہد کے مرکز بھی وہی علاقے تھے مگر پنجاب کے فرماں روا راجہ جے پال سے سرحد کے بعض مقبوضات پر تنازع کے باعث اس کا رُخ ہندوستان کی طرف مڑ گیا۔ کچھ عرصے تک اس کی تگ و دو صرف پنجاب تک محدود رہی، مگر بات بڑھتی گئی اور اسے اندرونِ ملک دور دور تک چھاپہ مارنے کے اسباب فراہم ہوتے گئے۔ چنانچہ پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے نگرکوٹ، تھانیسر، متھرا، قنوج، گوالیار، کالنجر وغیرہ پر بھی فوج کشی کی اور کافی مال و اسباب حاصل کیا۔

وہ ایک مدبّر سپہ سالار اور فوج کی کمان کرنے میں لاثانی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غزنی سے چل کر اتنے دور دراز علاقوں پر چھاپے مارے اور ہر حملے میں میدان اسی کے ہاتھ رہا۔ اس کا آخری اور سب سے مشہور حملہ سومناتھ کے مندر پر ہوا۔

یہ مندر گجرات میں ساحلِ سمندر کے قریب واقع تھا۔ سوم لفظ سے خیال ہوتا ہے کہ شاید چندرما دیوتا کا مندر تھا۔ چاند کی کشش کے باعث جب مدّ و جزر آتا تو سمندر کا پانی مندر کی دیوار سے ٹکراتا۔ چنانچہ عوام میں مشہور تھا کہ اس بُت کی پرستش کے لیے سمندر بھی آیا کرتا ہے۔ شمالی ہند کے باشندے جو مدّ و جزر کی حقیقت سے واقف نہ تھے سمندر کے پانی کو اس طرح گھٹتا بڑھتا دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ یہ لوگ جوق در جوق اس کی زیارت کے لیے جاتے اور گنگا جل

ساتھ لے جا کر اس پر چڑھاتے۔ اس مندر میں زر و جواہر اور دولت کا انبار تھا۔ ہندوستان کے متعدد راجہ اس کی امداد اور خبر گیری کرتے۔ حفاظت کے لیے ہر وقت بہت بڑی فوج پہرہ دیتی۔ محمود ۱۰۲۴ء میں حملے کی غرض سے ملتان آیا۔ یہاں ایک جرّار لشکر آراستہ کر کے اچانک گجرات پہنچ گیا۔ سومناتھ کی محافظ فوج نے زبردست مقابلہ کیا۔ انہیں تازہ کمک بھی پہنچتی رہتی تھی چنانچہ محمود کے چھکّے چھڑا دیے۔ مگر بالآخر میدان محمود ہی کے ہاتھ رہا۔ جس وقت محمود فاتح کی حیثیت سے مندر میں داخل ہوا ہے، تو پجاریوں نے بہت سا زر و جواہر اور کافی روپیہ پیسہ دے کر بت کو بچانا چاہا، مگر محمود نے کہا:۔

"میری آرزو ہے کہ قیامت کے دن محمودِ بت شکن کہلاؤں، محمودِ بُت فروش کے نام سے نہ پکارا جاؤں۔"

اور پھر گرز سے بت کے دو ٹکڑے کر دیے۔ بت کے اندر خلا تھا جس میں بیش بہا جواہرات بھرے ہوتے تھے۔ چنانچہ اس حملے میں کافی دولت اس کے ہاتھ آئی اور شہر غزنی مالامال ہو گیا۔ واپسی میں کسی مخالف پجاری نے بھٹکا دیا اور محمود مع اپنی فوج اور مالِ غنیمت کے ریگستان تھر میں پھنس گیا جس سے اسے سخت جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

محمود نے بھارت پر متعدد حملے کیے، مگر ہر مرتبہ لوٹ مار اور مخالفین کی سرزنش کے بعد واپس لوٹ گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یہاں مستقل حکومت قائم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ۱۰۲۶ء میں یہاں سے غزنی پہنچا اور چار سال مزید زندہ رہ کر ۱۰۳۰ء میں انتقال کر گیا۔

محمود کے بارے میں کئی قصّے مشہور ہیں، جس سے اس کی سیرت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک بار اس کے دربار میں ایک بڑھیا آئی۔ اس نے شکایت کی کہ میرا بیٹا ایک کارواں کے ساتھ جا رہا تھا، ڈاکوؤں نے مال و اسباب لوٹ لیا اور میرے بیٹے کو قتل کر دیا۔ آپ ڈاکوؤں کو سزا دیں اور آئندہ اس قسم کے واقعات کا سدباب کریں۔

محمود نے کہا" بڑی بی! تم جس مقام کا ذکر کر رہی ہو، وہ تو پایہ تخت سے بہت دور ہے۔ میں اتنے دور دراز علاقوں میں اس قسم کے واقعات کا سدّ باب کیسے کر سکتا ہوں؟"

محمود کا یہ جواب سن کر بڑھیا کو تاؤ آگیا۔ بولی "جب تم ان علاقوں کا انتظام نہیں کر سکتے تھے تو تم نے انہیں فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کیوں کیا؟"

بڑھیا کی بات معقول تھی۔ سلطان اس کی صاف گوئی سے بے حد متاثر ہوا۔ یہ وہی سلطان ہے جس کے نام سے بڑے بڑے فرماں روا کانپ جاتے تھے وہ آج بڑھیا کے سامنے بھیگی بلّی بن گیا۔ اُس نے بڑھیا کو لٹے ہوئے سامان کا معاوضہ دیا اور ڈاکوؤں کو سزا دینے کا وعدہ کیا اِس کے بعد سے وہ ہر کارواں کے ساتھ حفاظت کے لیے فوجی دستے بھیجنے لگا۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک شخص نے شکایت کی کہ ایک سرکاری افسر اس کی بیوی کو چھیننا چاہتا ہے۔ محمود مسلح ہو کر شب میں اس کے گھر گیا اور جب افسر بُرے ارادے سے وہاں پہنچا تو اندھیرے میں محمود نے اس کی گردن اڑا دی اِس کے بعد کسی افسر کو رعایا پر ظلم کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

بعض مورخین ایک قصہ محمود کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ ایک بار وہ اپنے وزیر کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں ایک درخت پر بیٹھے ہوئے دو اُلّو نظر آئے۔ محمود نے وزیر سے مذاق میں پوچھا "یہ دونوں کیا بات چیت کر رہے ہیں"

وزیر محمود کو مزید حملوں سے روکنا چاہتا تھا، موقع کو غنیمت سمجھا، بولا "جہاں پناہ! ان اُلوؤں میں ایک کا بیٹا ہے، ایک کی بیٹی۔ دونوں ان کا نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ بیٹا والا کہہ رہا ہے کہ اگر تم پچاس ویران گاؤں جہیز میں دو تو میں بیٹے کو بیاہ دوں۔ بیٹی والا کہہ رہا ہے کہ یہ کون سی مشکل بات ہے، سلطان سلامت ہے تو پچاس کے بجائے میں سو ویران گاؤں دے سکتا ہوں۔"

کہتے ہیں محمود وزیر کی اس گفتگو سے بہت متاثر ہوا۔ اس کے بعد سے اس نے کوئی حملہ نہ کیا حالانکہ یہ قصہ نوشیرواں سے متعلق ہے، خواہ مخواہ محمود کے سر چپک دیا گیا ہے۔

محمود نے بلاشبہ اپنی مملکت کو بہت وسیع کر لیا اور متعدد حملے کر کے کافی مال و دولت جمع کیا۔ وہ سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کا انبار دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا مگر کنجوس نہ تھا۔ اس نے علوم و فنون کی ترقی پر کافی دولت خرچ کی۔ اس نے غزنی میں بہت بڑا دینی مدرسہ قائم کیا۔ وہ خود تو معمولی پڑھا لکھا آدمی تھا، مگر علم کا بڑا قدر دان تھا۔ ایک رات وہ کہیں جا رہا تھا۔ ایک طالب علم کو دیکھا کہ کسی دُکان کی بتی کے سامنے کھڑا کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ طالب علم چراغ بتی کی مقدرت نہیں رکھتا۔ سلطان نے اُسے اپنا شمع دان بخش دیا۔ اس کی قدر دانی کے باعث دربار میں متعدد عالم، ادیب اور شاعر جمع تھے۔ چنانچہ اس کے دور میں فارسی زبان و ادب کی بڑی ترقی ہوئی۔

کہتے ہیں کہ مرتے وقت اس نے اپنی جمع کی ہوئی دولت پر نہایت حسرت کی نگاہ ڈالی اور بولا "میں نے ساری زندگی بے انتہا دولت جمع کی مگر آج دربارِ الٰہی میں خالی ہاتھ جا رہا ہوں۔ اس میں سے کوئی چیز بھی میرے ساتھ نہیں جا سکتی ساتھ جائیں گے تو صرف اعمال۔"

۱۔ شمالی ہند میں اسلام کی روشنی کیونکر پہنچی ؟

۲۔ محمود غزنوی کون تھا ؟ اس نے ہندوستان پر کیوں حملے کیے ؟

۳۔ سومناتھ کے متعلق تم کیا جانتے ہو ؟ محمود غزنوی کے سومناتھ پر حملے کا مختصر حال لکھو۔

۴۔ محمود کے متعلق کون کون سے قصے مشہور ہیں ؟ ان قصوں سے ان کے کن اوصاف پر روشنی پڑتی ہے ؟ تمہارے نزدیک وہ کیسا شخص تھا ؟ دلائل سے سمجھاؤ۔

باب ۱۴

معین الدّین چشتیؒ

محمود غزنوی کے حملوں کے باعث جب مسلمان ممالک کا شمالی ہند سے رابطہ بڑھا اور عرب، افغانستان اور ایران کے باشندے اندرون ہند سے واقف ہوگئے تو آمد و رفت کا بھی سلسلہ شروع ہوگیا۔ متعدد بزرگ ہمارے ملک کے مختلف حصّوں میں آئے۔ ان کی پاکیزہ زندگی اور مسلسل جدوجہد سے یہاں کے لاکھوں انسانوں کی سیرتیں سنور گئیں اور وہ بہت سی خرابیاں جو یہاں کے سماج میں جڑ پکڑ رہی تھیں، ان کی کوششوں سے دور ہوگئیں۔ ان بزرگوں میں سب سے مشہور معین الدین چشتیؒ ہیں۔

آپ افغانستان کے مشہور شہر سنجر کے رہنے والے تھے ۱۱۴۱ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن کا دور انتہائی پریشانیوں میں گذرا۔ ان دنوں ان کے وطن میں بڑی بدنظمی اور ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ ننھی سی عمر میں انہیں زمانے کے بہت سے نشیب و فراز دیکھنے پڑے جن سے ان کے تجربات میں اضافہ ہوا اور قلب کی کیفیت بدل گئی۔ تیرہ ۱۳ سال کے ہوئے تو آپ کے والد ماجد ترکِ وطن کر کے خراسان چلے گئے اور وہیں دو سال بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ ترکے میں آپ کو میوے کا ایک باغ اور ایک ہوائی چکّی ملی۔ آپ محنت کر کے ان کی آمدنی سے گھر کا خرچ چلاتے لیکن نگاہوں نے

جو دردناک مناظر دیکھے تھے، ان کی وجہ سے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں میں پھرا کرتا اور قلب عموماً اللہ کی طرف رجوع رہتا تھا۔

ایک دن آپ اپنے باغ میں پانی دے رہے تھے کہ ادھر سے ایک بزرگ کا گذر ہوا۔ آپ نے ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور ایک درخت کے سایے میں بٹھا کر کھانے کے لیے پھل پیش کیے۔ ان بزرگ کا نام ابراہیم قندوزی تھا ابراہیم قندوزی اپنے ننھے میزبان کی خاطر تواضع سے بہت خوش ہوئے چند دانے انگور کے کھائے، انہیں دعائیں دیں اور سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا جھولی سے نکال کر کھلایا۔ آپ نے اسے تبرک سمجھ کر بڑے شوق سے کھا لیا۔ ان بزرگ کی دعاؤں اور شانِ استغنا کا آپ پر بہت اثر پڑا۔ آپ نے باغ اور چکّی فروخت کر کے آمدنی غرباء میں تقسیم کر دی اور خود علم دین حاصل کرنے کے لیے سمرقند و بخارا کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ سات آٹھ سال بخارا میں قیام کر کے قرآن حفظ کیا اور محنت کر کے مولانا حسام الدین بخاری سے تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر اسلامی علوم حاصل کر لیے۔

آپ کو بزرگوں کی صحبت میں خاص لطف آتا تھا، چنانچہ تعلیم سے فارغ ہو کر بزرگوں کی تلاش میں جگہ جگہ پھرتے پھرے۔ آخر عراق کے شہر ہارون پہنچے۔ یہاں کے شیخ عثمان ہارونی ایک بڑے پایے کے بزرگ تھے، ان سے ملاقات کی۔ رفتہ رفتہ ان سے عقیدت پیدا ہو گئی۔ آپ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور خدمت میں حاضر رہنے لگے۔ انہیں کے ساتھ ایک بار حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔

اپنے پیر کے پاس چوبیس سال رہ کر آپ نے سیاحت کی اجازت مانگی پیدل مکے گئے اور وہاں سے روضۂ پاک کی زیارت کے لیے مدینے پہنچے۔ مدینے سے آپ نے ہندوستان کا قصد کیا۔ چالیس دوسرے بزرگ بھی اس سفر میں آپ کے ساتھ ہو گئے۔ مختلف مقامات کی سیر کرتے اور لوگوں کو دین کی باتیں بتاتے یہ

حضرات سبزوار پہنچے۔ یہاں یادگار محمد حکومت کرتا تھا، جو ملحد تھا اور بغداد کی مرکزی حکومت کا باغی بھی۔ ان لوگوں کا قافلہ اسی کے باغ میں ٹھہرا۔ اسے اطلاع ملی تو اس نے آکر بہت برا بھلا کہا، لیکن بعد میں آپ کے برتاؤ سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے تمام برائیوں سے توبہ کرکے نہ صرف آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلی بلکہ حکومت چھوڑ کر دین کی اشاعت کے لیے آپ کے ساتھ ہوگیا۔

یہاں سے روانہ ہوکر آپ ملتان اور لاہور ہوتے ہوئے دہلی پہنچے۔ راستے میں جہاں کہیں بھی قیام فرماتے، اسلام کی تبلیغ کرتے۔ آپ کے سمجھانے بجھانے سے متعدد لوگ ایمان لائے۔ آپ نے مستقل قیام کے لیے اجمیر کو پسند فرمایا۔ اجمیر ان دنوں پرتھوی راج کا پایہ تخت تھا۔ چند ہی دنوں میں آپ کا چرچا ہونے لگا۔ پرتھوی راج پہلے تو آپ کو جاسوس سمجھ کر تنگ کرنے لگا مگر جب اس نے آپ کی پاکیزہ تعلیم اور بے داغ سیرت کا بطور خود مشاہدہ کرلیا تو اسے اطمینان ہوگیا۔ قرب و جوار کے بہت سے اشخاص اور خود پرتھوی راج کے کئی درباریوں کو آپ سے بے انتہا عقیدت ہوگئی اس پر راجہ نے پھر ستانا شروع کیا۔ آپ کو متاثر کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے اپنی مملکت کے دو مشہور جادوگر بھیجے، ایک شادی دیو، دوسرا جے پال۔ مگر آپ پر ان کا جادو نہ چل سکا بلکہ یہ محسوس کرکے کہ آپ حق پر ہیں اور آپ کی پشت پر اللہ کی قوت ہے وہ دونوں خود متاثر ہوئے اور کہتے ہیں کہ دونوں مسلمان ہوگئے۔ پھر آپ کو شہر میں لے جاکر اس مقام پر آباد کیا جہاں آپ کا مزار بنا ہوا ہے۔ آپ نے پرتھوی راج کو بھی دین کی دعوت دی تھی مگر اس نے قبول نہ کی۔

آپ کو اللہ نے بہت بڑی عمر دی، جسے آپ نے اللہ کی یاد اور اس کے دین کی اشاعت میں صرف کیا۔ آپ ۹۴ سال زندہ رہے، بے شمار لوگوں کو راہ راست پر لگایا۔ ۶۳۵ھ میں آپ کا انتقال ہوگیا۔

نماز سے آپ کو غیر معمولی شغف تھا۔ آخری عمر میں تو اکثر رات رات بھر نماز میں

پڑھتے۔ آپ عموماً باوضو رہتے۔ کبھی کبھی عشا کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے۔ آپ اپنی مجلس میں نماز کی بے حد تعریف کرتے۔ تلاوت کا یہ حال تھا کہ دن رات میں اکثر دو بار کلام پاک ختم کرتے۔ روزے بھی کثرت سے رکھتے۔ سنّت کا بہت خیال رکھتے یہاں تک کہ کبھی بائیں ہاتھ سے پانی نہ پیتے اور نہ مسجد میں داخل ہوتے وقت بائیں پیر سے داخل ہوتے۔

آپ کا اخلاق بھی انتہائی پاکیزہ تھا۔ آپ کا بڑے سے بڑا نقصان کر کے بھی اگر کوئی معافی مانگتا تو فوراً معاف کر دیتے۔ ایک بار ایک شخص آپ کو قتل کرنے کی غرض سے آیا اور مجلس میں شریک ہو کر چکنی چپڑی باتیں کرنے لگا۔ آپ نے بھانپ لیا اور بولے "جس کام کے لیے آئے ہو اُسے پورا کرو" یہ سُن کر وہ کانپنے لگا اور چھُری نکال کر سامنے رکھ دی۔ آپ اس پر بالکل ناراض نہ ہوئے حالانکہ وہ آپ کو قتل کرنے کے ارادے سے آیا تھا۔ تاکید کی کہ اس شخص کا نام مت بتانا جس نے تمہیں اس کام کے لیے بھیجا تھا کیونکہ کسی کا راز پوشیدہ رہے تو اچھّا ہے۔ اس بات سے وہ شخص اتنا متاثر ہوا کہ فوراً مسلمان ہو گیا اور آپ ہی کی خدمت میں لگ گیا۔ آپ کا یہی اخلاق اور دین کی لگن اس تاریک دور میں یہاں دین حق کی روشنی پھیلانے میں مددگار ثابت ہوئی اور محمد غوری کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے سے پہلے پہلے ہندوستان کی زمین اسلام کے لیے تیار ہو گئی۔ آپ کے بہت سے جلیل القدر شاگرد ہوئے جن میں قطب الدین بختیار کاکیؒ سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

۱۔ حضرت معین الدین چشتیؒ کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟ ان کا بچپن کس طرح گذرا؟

۲۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کہاں گئے؟ کیوں؟ وہاں کیا واقعات پیش آئے؟

۳۔ آپ ہندوستان کس طرح تشریف لائے؟ یہاں مستقل قیام کہاں رہا؟

۴۔ پرتھوی راج نے آپ کی مخالفت کیوں کی؟ شادی دیو اور اجے پال کا کیا واقعہ ہے؟

۵۔ آپ کی سیرت و کردار کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟ آپ کی کوششوں کا کیا اثر ہوا؟

باب ۱۵

محمد غوری اور پرتھوی راج

معین الدین چشتیؒ کے باب میں تم پڑھ چکے ہو کہ آپ نے اپنے قیام کے لیے اجمیر کو منتخب فرمایا تھا اور وہیں سے اندرونِ ملک میں اشاعتِ دین کی جدوجہد شروع کی تھی۔ جب آپ تشریف لائے، اس وقت پورا شمالی ہند ننھی ننھی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان ریاستوں کے راجپوت حکمراں آپس میں لڑتے اور ایک دوسرے کو مٹانے کے درپے رہتے۔ ان راجاؤں میں سب سے طاقتور پرتھوی راج تھا۔

اجمیر اسی راجہ کے قبضے میں تھا۔ یہ راجہ نہایت جنگ جو اور ملک گیری کا شائق تھا۔ اجمیر تو اس کی آبائی میراث تھی، اور دہلی نیز اس کے اطراف کا علاقہ اسے اپنے نانا اننگ پال والیِ دہلی سے ورثے میں ملا تھا۔ اننگ پال کی مملکت کافی وسیع تھی۔ لاولد مرنے کے باعث اس کی مملکت اس کے دو نواسوں پرتھوی راج اور جے چند میں بٹ گئی تھی۔ جے چند کے قبضے میں قنوج اور اس کے اطراف کا علاقہ آیا تھا۔ اس طرح پرتھوی راج دو مملکتوں کا راجہ ہونے کے باعث طاقت و قوت میں جے چند سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھا۔ چنانچہ جے چند اس سے حسد رکھتا تھا اور اس کی قوت توڑنے کی فکر کرتا۔ کہتے ہیں کہ ایک بار جے چند نے اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے

کے لیے راجسو یگیہ" کیا اور ساتھ ہی اپنی بیٹی سنجو گتا کا سوئمبر رچا۔ اس تقریب میں اس نے تمام راجاؤں کو مدعو کیا لیکن پرتھوی راج نے شرکت نہ کی۔ وہ اس یگیہ میں شرکت کو اپنی ہتک سمجھتا تھا۔ اس کے نہ آنے پر جے چند نے اس کی توہین کرنے کے لیے اس کا ایک بُت بنوا کر دربان کی جگہ نصب کرا دیا۔ سوئمبر ہوا، سنجو گتا جے مالا لے کر پرتھوی راج کے بُت کے پاس پہنچی اور ہار اس کے گلے میں ڈالنا چاہا۔۔۔ پرتھوی راج وہیں قریب ہی کہیں چھپا تھا۔ وہ سنجو گتا کو گھوڑے پر بٹھا کر بھگا لے گیا۔ جے چند کو اس کا بڑا ملال رہا۔ اس نے بدلہ لینے کی ٹھانی۔

اتفاق سے انہیں دنوں غزنی کے پایہ تخت پر محمد غوری کا قبضہ ہو گیا۔ یہ رہنے والا غور کا تھا جہاں کے وحشی قبائل کو محمود غزنوی نے مغلوب کر کے آدابِ جہاں بانی سکھائے تھے، مگر محمد غوری کے جنگ جُو قبیلے نے محمود غزنوی کے جانشینوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر غزنی پر اپنا تسلط جما لیا تھا۔ تم پڑھ چکے ہو کہ محمود نے اپنی سلطنت پنجاب تک وسیع کر لی تھی۔ اس کا جانشین ہونے کی حیثیت سے محمد غوری بھی پنجاب کا دعوے دار ہوا۔ اس نے پہلے تو پنجاب کے ان سرداروں کی سرکوبی کی جو حکومت غزنی کے باغی ہو گئے تھے۔ پھر اطراف کے ان راجاؤں پر حملے کیے جنہوں نے ان مجرم باغیوں کو پناہ دی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے پنجاب کا بیشتر حصہ واپس لے لیا اور پھر پرتھوی راج سے پنجاب کے ان علاقوں کی واپسی کا مطالبہ کیا جو پہلے سلطنت غزنی میں شامل تھے۔ پرتھوی راج نے واپس کرنے سے انکار کر دیا اور مخالفت پر کمر باندھی۔ غوری نے لاہور سے روانہ ہو کر بھٹنڈا کے قلعہ پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ پرتھوی راج کو اطلاع ملی، تو وہ ایک بہت بڑی فوج لے کر مقابلے کے لیے آیا۔ محمد غوری کے پاس اس وقت صرف تین ہزار کی فوج تھی۔ ظاہر ہے پرتھوی راج کی ڈھائی تین لاکھ فوج کے

مقابلے میں غوری کے اس معمولی دستے کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی مگر پھر بھی محمد غوری نے پیٹھ دکھانا مناسب نہ سمجھا۔ ترائن (تلاوڑی) کے مقام پر دونوں میں مڈ بھیڑ ہوئی۔ محمد غوری کی فوج نے شکست کھائی اور وہ بہت بری طرح زخمی ہوا۔

محمد غوری کو اپنی اس شکست کا بے حد قلق تھا۔ وہ جلد ہی انتقام لینا چاہتا تھا۔ چند ہی دنوں میں اس نے ڈیڑھ لاکھ کی ایک زبردست فوج تیار کر لی اور ۱۱۹۲ء میں جنگ کے لیے چل کھڑا ہوا۔ پرتھوی راج بھی اپنے دشمن کی طرف سے غافل نہ تھا۔ اس نے بھی مقابلے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ البتہ جے چند سے اس کے تعلقات خراب ہو گئے تھے اس لیے بہت سے راجاؤں کی حمایت سے وہ محروم ہو چکا تھا۔ جے چند کی ہمدردیاں بہت حد تک محمد غوری کے ساتھ تھیں۔ پھر بھی پرتھوی راج نے اپنے حریف کے مقابلے میں تقریباً دوگنی فوج فراہم کر لی تھی اس بار بھی نرائن ہی کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ مقابلہ سخت تھا آخر میں غوری کی فوج نے ایک جنگی چال چلی۔ اس کے سپاہی بظاہر پسپا ہونے لگے۔ مخالفین نے فتح کی خوشی میں صف بندی توڑ دی۔ چنانچہ غوری کی فوج نے پلٹ کر جو حملہ کیا تو پرتھوی راج کی فوج درہم برہم ہو گئی۔ پرتھوی راج مارا گیا۔ اس کے قلعے محمد غوری کے قبضے میں آئے۔ اس نے دہلی اور اجمیر کے دو حصے کر کے پرتھوی راج کے دو بیٹوں کے حوالے کر دیا اور اپنے غلام قطب الدین کو دیگر مقبوضات کا حاکم مقرر کر کے خود وطن لوٹ گیا۔

ابھی چند ہی دن گذرے تھے کہ جے چند اور دوسرے راجاؤں کی شہ سے پرتھوی راج کے بیٹے نے بغاوت کر دی۔ چنانچہ مجبوراً قطب الدین نے دہلی اور میرٹھ کو فتح کر کے اپنا پایہ تخت لاہور سے دہلی منتقل کر لیا۔

۱۲۰۶ء میں محمد غوری ایک ملحد کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد
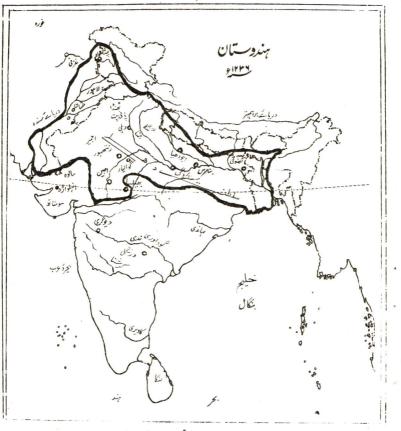
قطب الدین ہندوستانی مقبوضات کا خود مختار حاکم بن گیا اور دہلی کو مستقل پایۂ تخت بنا کر شمالی ہند میں پہلی مسلمان حکومت قائم کی۔

محمد غوری کی زندگی میں قطب الدین نہایت فرض شناس خادم اور بہترین سپہ سالار کی حیثیت سے اپنے مالک کی آنکھوں کا تارا بنا رہا۔ بادشاہ ہونے پر اس نے اپنی مملکت کو خود اپنی کوششوں سے کافی وسیع کیا اور حکومت کے فرائض بھی نہایت خوش اسلوبی اور مستعدی سے انجام دیے۔ وہ نسلاً ترک تھا۔ بچپن ہی میں ماں باپ کی شفقت سے محروم کر کے غلام بنا لیا گیا تھا۔ مگر یہ غلامی اور والدین سے جدائی اس کے حق میں بہت مبارک ثابت ہوئی کیونکہ اسی کی بدولت اسے اسلام جیسی نعمت اور پھر دہلی کی بادشاہت نصیب ہوئی۔ پہلے اسے نیشاپور کے قاضی فخر الدین عبد العزیز نے خریدا۔ قاضی صاحب موصوف امام ابو حنیفہ رحمہ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ نے اسے پالا پوسا اور تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا۔ بعد میں ایک سوداگر اسے خرید کر غزنی لایا، اور محمد غوری کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس نے اسے فن سپہ گری اور انتظام ملکی میں مہارت پیدا کرائی۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے وہ سنہ ۱۱۹۲ء میں غوری کے ہندوستانی مقبوضات کا نائب اور پھر سنہ ۱۲۰۶ء میں سلطنتِ دہلی کا سب سے پہلا مسلمان تاجدار بن گیا۔ اسے غریبوں اور دکھیوں کے دُکھ درد کا پورا احساس تھا، چنانچہ ان کی غیر معمولی امداد کرتا۔ اس کی فیاضی کے باعث لوگ اسے لکھ بخش یا لکھ داتا کے نام سے یاد کرتے۔ وہ شاہی تکبّر سے بچنے کے لیے اپنے دورِ غلامی کا لباس پہن کر آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا اور اپنے کو مخاطب کر کے کہا کرتا۔ ”قطب الدین تم اپنی حیثیت کو بھول کر خدا کے باغی اور سرکش نہ بن جانا۔ یاد رکھو! ایک دن تم اسی حال میں تھے اور اب سلطان ہونے کے بعد بھی سلطانِ کائنات کے غلام ہو۔“

باب ۱۶

مسلمانوں کے ہند پر حملے

اور

قلّتِ تعداد کے باوجود کامیابی کے اسباب

تم نے محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملوں کا حال پڑھا۔ تم بزرگانِ دین کی ان کوششوں سے بھی ایک حد تک روشناس ہو گئے جو انہوں نے اس ملک کے مختلف گوشوں میں اسلام کی اشاعت کے لیے انجام دیں۔ تم نے محسوس کیا ہو گا کہ ابتدا میں اس ملک کو اسلام سے روشناس کرانے کے اصل ذرائع تین تھے۔

۱۔ **عرب تجّار :-** عرب تاجروں اور اُن کے ساتھ آنے والے مبلّغین کے ذریعے سب سے پہلے ہمارے ملک تک اسلام کی روشنی پہنچی۔ انہیں کی کوششوں سے ساحلی علاقوں کے باشندے اسلام اور اس کی تعلیمات سے روشناس ہوئے۔

۲۔ **مسلمان حملہ آور :-** یہ لوگ فوجی قوت سے اندرونِ ملک میں داخل ہوئے اور اگرچہ انہوں نے اپنے طرزِ عمل سے اسلام کی پوری پوری نمائندگی نہیں کی، بلکہ بسا اوقات اُن سے یا ان کے ساتھیوں سے ایسی حرکات بھی سرزد ہوئیں جو ملک کو اسلام سے متنفر کر دینے والی تھیں پھر بھی ان کے حملوں کا یہ نتیجہ ضرور

ہوا کہ مسلمان ممالک کا اندرون ہند سے رابطہ قائم ہوگیا اور دین حق کی دعوت کے لیے راستے کھل گئے۔

۳۔ **مبلّغین اور بزرگان دین:۔** بہت سے بزرگ اپنے مخلص عقیدت مندوں کے ساتھ ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے اور منظّم طور پر دین کی اشاعت کا کام کرنے لگے۔ ان کا تقویٰ، خلوص اور ان تھک کوششوں سے ہزاروں ہندوستانی مشرّف بہ اسلام ہوئے، متعدد افراد کے قلوب نرم اور اخلاق پسندیدہ ہوگئے۔ یہاں کے باشندوں کی ایک خاصی تعداد کے مسلمان ہو جانے کی وجہ سے اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام اور بقا کے لیے زمین ہموار ہوگئی۔

جہاں تک عرب تجّار، مبلّغین اور فقیر منش بزرگوں کی مساعی کا تعلق ہے، تقریبًا تمام لوگ انہیں سراہتے اور ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی مسلمانوں کے علاوہ کتنے غیر مسلم بھی ان بزرگوں کے مزار پر عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں لیکن مسلمان حملہ آوروں کو کچھ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ ان پر لوٹ مار، قتل و غارت گری، بے جا تشدّد، ملک گیری کی بڑھتی ہوئی ہوس، اور جبری تبدیلیٔ مذہب کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض الزامات کسی نہ کسی درجے میں صحیح ہیں لیکن جب ہم ان اسباب پر غور کرتے ہیں۔ جو ان حملوں کے محرّک ہوئے تو ان حملہ آوروں ہی کی طرح وہ لوگ بھی موردِ الزام ٹھہرتے ہیں جن پر یہ حملے ہوئے۔ مثلاً:۔

حملوں کے اسباب

۱۔ ہندوستانی راجہ ان باغی گروہوں کو اپنے یہاں پناہ دیتے تھے جو مسلمانوں کی مملکت میں بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کرنے کے بعد یہاں بھاگ آتے تھے۔ ان باغیوں میں باطنیہ بھی تھے اور قرامطہ و ملاحدہ بھی۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے متعدّد

گروہ عموماً مسلمان مملکتوں کا تختہ الٹنے کی سازش کرتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے اتنے بڑے جرم کو کوئی مملکت برداشت نہیں کر سکتی۔ مسلمان حکمراں جب ان مجرموں کی واپسی کا مطالبہ کرتے تو پناہ دینے والوں کی طرف سے انہیں کوئی معقول جواب نہ ملتا اور بحالت مجبوری جب وہ ان کی سرکوبی کے لیے خود آگے بڑھتے تو ان باغیوں کی حمایت میں یہاں کے راجہ ان سے جنگ کرتے۔ اس طرح گویا حملہ کرنے کے لیے خود انہی کی طرف سے مواقع فراہم کیے جاتے۔

۲۔ مسلمان ممالک کی سرحدیں ہندوستان سے مل چکی تھیں۔ پڑوسی مملکتوں میں سرحدی تنازعات چلتے ہی رہتے ہیں۔ ان تنازعات کا تصفیہ کرنے کے لیے سمجھوتے ہوتے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسے بیشتر سمجھوتوں کی شرائط توڑنے اور چھیڑ چھاڑ کرنے میں پہل عموماً ہندوستان کے راجاؤں کی طرف سے ہوتی تھی چنانچہ اکثر حملے اس سبب سے بھی ہوئے۔

مسلمان حملہ آوروں کی کامیابی کے اسباب

ان حملہ آوروں کی تعداد اور سامانِ جنگ اپنے حریفوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتا تھا پھر بھی میدان عموماً انہیں کے ہاتھ رہتا تھا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ پورے ملک پر قبضہ کر کے مسلمان حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بھی دراصل کئی اسباب ہیں۔

۱۔ مسلمانوں کی فوج لڑائی کے فن سے بخوبی واقف ہوتی تھی۔ ہندوستان کے راجہ فوج تو بہت بڑی جمع کر لیتے تھے مگر یہ بھرتی وقت کے وقت ہوتی تھی چنانچہ ان کی فوج کی بہت بڑی اکثریت عموماً غیر تربیت یافتہ رہتی اور اپنے حریف کے مقابلے میں بے جگری سے لڑنے کے باوجود ناکام ہو جاتی۔

۲۔ مسلمان اچھے شہسوار بھی تھے اور بہترین تیر انداز بھی۔ یہ لوگ تیز رفتار

گھوڑوں پر سوار ہو کر چاروں طرف یک بارگی ٹوٹ پڑتے اور اپنے حریفوں کو گھیرے میں لے لیتے۔ ہندوؤں کی پیادہ فوج اپنی کثرتِ تعداد کے باوجود ان تیر انداز شہ سواروں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

۳۔ ہندوؤں کو اپنے جنگی ہاتھیوں پر ناز تھا۔ بسا اوقات اُن کے دیو پیکر ہاتھیوں کی ڈراؤنی صورت اور خوفناک چنگھاڑ سے گھوڑے بدک کر بھاگتے۔ ان سے بچاؤ کے لیے حملہ آور ایسی تدبیریں کرتے کہ یہ ہاتھی خود اپنی فوج کو کچل کر رکھ دیتے۔ وہ لوگ یا تو تیروں سے زخمی کر کے انہیں بھگا دیتے، یا آتش بازیاں پھینک کر انہیں بھڑکا دیتے۔ ہاتھی سواروں کے پیچھے پیادہ فوج ہوتی جو ان ہاتھیوں کے پیروں سے کچل کر تباہ ہو جاتی۔

۴۔ حملہ آور ہندوستانی راجاؤں کے مقابلے میں جنگی چالوں سے بھی زیادہ واقف تھے، چنانچہ کبھی کبھی اپنے حریفوں کو دھوکے یا غلط فہمی میں مبتلا کر کے شکست دے دیتے۔

۵۔ ہندوستان اس وقت بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان ریاستوں کے حکمرانوں میں پھوٹ اور نا اتفاقی تھی۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے حریفوں کے مقابلے میں اجتماعی جدوجہد نہیں کر سکتے تھے اور اگر کبھی متحد ہو بھی جاتے تھے تو اونچ نیچ کا فرق و امتیاز انہیں اپنے سردار کے علاوہ دوسرے سرداروں کے تابع فرمان ہو کر لڑنے نہیں دیتا تھا اس کے برعکس تمام مسلمان فوجی ایک ہی سپہ سالار کی قیادت میں منظم جنگ کرتے تھے۔

۶۔ مسلمان حملہ آور اپنے فوجیوں کو مرنے مارنے پر آمادہ کرنے کے لیے ان لڑائیوں کو مذہبی جنگ یا جہاد کا نام دیتے اور مذہبی جذبات کو اُبھار کر کام لیتے تھے۔ ہندوؤں کے پاس اتنا دل کش کوئی نعرہ نہ تھا جو اُن کے تمام فوجیوں کو اپنی جان نچھاور کرنے پر آمادہ کر سکتا۔

۷۔ سب سے آخری مگر اہم ترین سبب یہ تھا کہ بھارتی سماج مجموعی طور پر سیاسی، اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی نقطہ نظر سے زوال کی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ اس کے ذمے داروں میں ملک کی باگ ڈور سنبھالنے اور اسے فتنہ و فساد سے بچانے کی صلاحیت باقی نہ تھی۔ ان کے ہاتھ سے بناؤ سے کہیں زیادہ بگاڑ کے کام ہونے لگے تھے۔ اس لیے قدرت نے اپنے قدیم دستور کے مطابق اس ملک کا انتظام یہاں کے اصل باشندوں سے چھین کر ایسے لوگوں کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جو بہتر صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اس قضا و قدر کے فیصلے کو کوئی قوت ٹال نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ حملہ آور اس ملک میں مسلمان حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ہر چند یہ لوگ اسلام کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے پھر بھی ان میں اپنے حریفوں کے مقابلے میں انتظامی صلاحیت بھی زیادہ تھی اور وہ نئے جوش اور بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ امیدوار بن کر میدان میں آئے تھے۔ اس لیے انہیں اس ملک کا انتظام سونپا گیا اور بلا شبہ ایک مدت تک اس ملک میں جتنے بناؤ کے کام ہوئے وہ انہی کے ہاتھوں انجام پائے اگرچہ بعد میں انہوں نے بہت کچھ بگاڑا بھی۔

۱۔ ہندوستان میں اسلام کن کن ذرائع سے پہنچا؟ ہر ایک پر مختصر نوٹ لکھو۔

۲۔ مسلمانوں کے ہند پر ابتدائی حملے کن اسباب سے ہوئے تھے؟ حملہ کرنے میں وہ کہاں تک حق بجانب تھے؟

۳۔ قلت تعداد کے باوجود حملہ آور کیوں کامیاب ہو جاتے تھے؟

۴۔ اللہ میاں کسی ملک کا انتظام کسی گروہ سے چھین کر کسی دوسرے گروہ کے حوالے کیوں کرتے ہیں؟ جس گروہ کے سپرد ایک بار انتظام کیا جاتا ہے اس کے پاس کب تک برقرار رہتا ہے؟ مثالوں سے واضح کرو۔

باب ۱۷

درویش تاجدار ـــ التمش

بہت دنوں کی بات ہے شہر بخارا کے چوک میں ایک کم سن بھولا بچہ کھڑا زاروقطار رو رہا تھا۔ اُدھر سے ایک درویش کا گذر ہوا۔ بچے کو روتا دیکھ کر درویش کا دل بھر آیا۔ قریب جا کر رونے کا سبب پوچھا۔ بچہ بولا "میرے مالک نے انگور لانے کے لیے مجھے پیسے دیے تھے وہ نہ جانے راستے میں کہاں گر گئے۔ اب خالی ہاتھ مالک کے پاس کیوں کر جاؤں"۔

درویش نے کہا "گھبراؤ نہیں میں تمہیں انگور دلا دوں گا۔ ذرا بتاؤ تو تم کون ہو؟"

بچے نے کہا "میرا نام شمس الدین ہے، میں ایک شریف ترک کا بیٹا ہوں۔ میرے والد اپنے قبیلے کے بہت ہی معزز آدمی ہیں۔ میرے چچازاد بھائی دھوکے سے مجھے باہر لے گئے اور حسد میں آ کر حضرت یوسفؑ کی طرح ایک سوداگر کے ہاتھ بیچ دیا۔ اسی سوداگر کے ساتھ میں بخارا پہنچا۔ یہاں حاجی جمال الدین صاحب نے مجھے خرید لیا۔ اب میں انہیں کا غلام ہوں۔ وہ مجھے اپنی اولاد کی طرح مانتے ہیں"۔

شمس الدین کی گفتگو اور اس کے چہرے بشرے سے درویش نے بھانپ لیا کہ یہ بچہ بہت ہی ہونہار ہے۔ گو آج غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے مگر آگے چل کر

بہت بڑا آدمی ہوگا۔ اسے دکان پر لے جا کر انگور دلائے اور کہا ''تمہاری یہ غلامی تمہارے درجات بلند کرنے میں بڑی مددگار ثابت ہوگی۔ بڑے ہو کر تم بھی حضرت یوسفؑ کی طرح ایک سلطنت کے مالک ہوگے۔ مگر دیکھو جب اللہ تمہیں اپنی رحمتوں سے نوازے تو غریبوں، محتاجوں اور درویشوں کو بھول نہ جانا۔ ضرورت مندوں کا خاص طور پر خیال رکھنا۔''

بچے نے درویش کی نصیحت غور سے سنی اور حسنِ سلوک کا وعدہ کیا۔

حاجی صاحب موصوف نے اس کی تعلیم و تربیت کا بہت معقول انتظام کیا۔ اسے بھی بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے اور ان سے ادب آداب، نیز دین کی باتیں سیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ جب ذرا بڑا ہوا تو حاجی صاحب موصوف نے قطب الدین ایبک (سلطنت دہلی کا پہلا مسلمان بادشاہ) کی خدمت میں لے گئے۔ قطب الدین اس کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا اور منھ مانگے دام دے کر خرید لیا۔

شاہی حلقے میں پہنچ کر شمس الدین کو اپنی بہادری اور قابلیت کے جوہر دکھانے کا خوب موقع ملا۔ چند ہی دنوں میں وہ سب کی آنکھوں کا تارا ہوگیا۔ قطب الدین اس کو دل سے چاہنے لگا اور مزید ترقی کے مواقع دینے کے لیے اس نے اسے آزاد کر کے اپنی بیٹی سے شادی کر دی۔

محمد غوری کی وفات کے بعد ۱۲۰۶ء میں جب قطب الدین شمالی ہندوستان کا سلطان ہوا، تو اس نے شمس الدین کو صوبہ بدایوں کا گورنر مقرر کیا۔ چار سال بعد قطب الدین بھی چل بسا اور اس کی جگہ اس کا منھ بولا بیٹا (لے پالک) آرام شاہ تخت نشین ہوا، مگر اس کی نااہلیت کے باعث تمام صوبے آزاد ہونے لگے۔ بالآخر سلطنت کے بڑے بڑے عہدیداروں نے مل کر اس کے بجائے شمس الدین التمش کو اپنا فرماں روا منتخب کر لیا۔ اس طرح وہی غلام جسے قطب الدین نے ڈیڑھ ہزار

روپئے میں مول لیا تھا، اللہ کی نوازش اور اپنی اولوالعزمی اور لیاقت سے شمالی ہند کا فرماں روا ہوا۔

تخت نشین ہونے کے بعد التمش کو آرام شاہ اور ان صوبے داروں اور رجواڑوں سے نمٹنا پڑا جو آرام شاہ کے یک سالہ دورِ حکومت میں خود مختار ہو گئے تھے ایک ایک کر کے اس نے سب کو پچھاڑا اور پندرہ بیس سال کے اندر بنگال سے صوبۂ سرحد تک پورا شمالی ہندوستان اس کے قبضے میں آ گیا۔

اب التمش کی شہرت بہت دور دور تک پہنچی۔ خلیفۂ وقت المستنصر نے بغداد سے اس کی حکومت کو سندِ جواز بھیجی اور اسے سلطان الہند تسلیم کیا۔ عباسی خاندان کا اقتدار تو اب بہت ہی گھٹ گیا تھا پھر بھی ساری دنیا کے مسلمان خلیفۂ وقت کا احترام کرتے، اور خطبے میں پہلے اس کا نام اور پھر اپنے ملک کے مسلمان فرماں روا کا نام پڑھا کرتے تھے۔ خلیفہ کے سفیر جب سند لے کر دہلی پہنچے تو التمش نے اس خوشی میں بہت زبردست جشن منایا اور اس کی یادگار باقی رکھنے کے لیے سکّوں پر خلیفۂ وقت کا نام کندہ کرایا۔

اتنی بڑی سلطنت کا فرماں روا ہو جانے کے باوجود التمش میں غرور نام کو بھی نہ تھا۔ وہ بڑا خدا ترس، رحم دل، سخی اور دلیر تھا۔ ارکان اسلام کی سختی سے پابندی کرتا اور دوسروں کو بھی ترغیب دیتا۔ راتوں کو جاگ کر عبادت کرتا۔ عالموں اور بزرگوں کی صحبت میں رہتا اور جب بھی وقت ملتا، ان کے پاس اچھّی اچھی باتیں سیکھنے جاتا۔ خواجہ معین الدین چشتی کے سب سے جلیل القدر شاگرد بختیار کاکیؒ کی مجلس میں اکثر حاضر رہتا۔ ان بزرگ نے مرتے وقت وصیّت کی تھی کہ میرے جنازے کی نماز وہ پڑھائے جس نے کبھی عصر کی سنّتیں قضا نہ کی ہوں، ہمیشہ نماز با جماعت میں تکبیر اولیٰ سے شریک رہا ہو اور حرام کی طرف کبھی قدم

نہ بڑھایا ہو۔ وصیت کی ان شرطوں پر التمش پورا اترا۔ چنانچہ اسی نے جنازے کی نماز پڑھائی۔ ان بزرگ سے التمش کو بے حد محبت تھی۔ انہیں کی یادگار میں اس نے مزار کے قریب قطب مینار کی بالائی پانچ منزلیں مکمل کرائیں۔

درویش نے بچپن میں جو نصیحت کی تھی التمش اسے ساری زندگی نہ بھولا۔ سلطان ہونے کے بعد تو اس کا معمول ہو گیا تھا کہ رات میں گدڑی پہن کر اور اشرفیوں کی تھیلیاں ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوتا، غریبوں اور محتاجوں کو ڈھونڈھتا پھرتا۔ ہر مستحق کے دروازے پر جاتا، حالات پوچھتا اور مدد کرتا۔ ضرورت مندوں، بے کسوں اور مظلوموں کو عام اجازت تھی کہ وہ دربار میں بلا جھجک آجائیں۔ یہ ان کی ضرورتیں پوری کرتا۔ اس نے اپنے گھر کے باہر ایک زنجیر لٹکا دی تھی اور مملکت میں یہ اعلان کرا دیا تھا کہ جس کسی پر ظلم ہو وہ زنجیر ہلا کر مطلع کرے، میں اسی وقت سماعت و انصاف کے لیے حاضر ہوں گا۔ مظلوموں کی فریاد پر کان نہ دھرنے کا جو وبال قیامت کے دن ہوگا اس کے تصور سے سلطان کانپ اٹھتا تھا۔

ان ہی اوصاف کی بنا پر تو بہت سے لوگ التمش کو اولیاء اللہ میں شمار کرتے ہیں۔

۱۔ التمش کون تھا؟ وہ کس طرح بخارا پہنچا؟

۲۔ درویش سے اس کی کیا بات چیت ہوئی؟ اس کا التمش نے کیا اثر لیا؟

۳۔ وہ کس طرح دہلی کا سلطان بنا؟

۴۔ اس کے عادات و اطوار کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟

۵۔ عدل و انصاف کے لیے اس نے کیا انتظامات کیے تھے؟

۶۔ التمش کو لوگ کیوں درویش تاجدار کہتے اور اولیاء اللہ میں شمار کرتے ہیں؟

باب ۱۸

نیک دل سلطان

آج سے کوئی سات سو سال پہلے کی بات ہے، دہلی میں ایک بادشاہ رہتا تھا۔ ہمارے ملک کے بیشتر حصے پر اسی کی حکومت تھی۔ عرف عام میں وہ سلطان کے نام سے مشہور تھا۔ ایک دن کی بات ہے اس کی ملکہ کھانا پکا رہی تھی۔ سوئے اتفاق توے سے روٹی اتارنے میں ملکہ کا ہاتھ جل گیا۔ وہ ہائے اللہ کرتی ہوئی سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ سلطان بیٹھا قرآن مجید کی کتابت کر رہا تھا۔ ملکہ کو تکلیف میں دیکھا تو اس کا دل بھر آیا۔ بولا:-

"کیا بات ہے ملکہ! ہاتھ میں کیا ہوا؟

ملکہ :- کیا کہوں جہاں پناہ! روٹی اتار رہی تھی، توے سے ہاتھ جل گیا۔

سلطان:- اللہ خیر! اچھا گھبراؤ نہیں۔ میں دوا لاتا ہوں۔"

(سلطان کتابت چھوڑ کر اٹھتا ہے، اور خود ہی ملکہ کے زخم پر معمولی سی دوا لگا دیتا ہے۔ ملکہ کچھ سکون محسوس کرتی ہے)

ملکہ :- جہاں پناہ! اب کیا ہوگا؟ گھر میں اور کوئی ہے نہیں۔ دوسرے کام تو الگ رہے، کھانا کون پکائے گا؟

سلطان:- تم فکر نہ کرو۔ جب تک تمہارا ہاتھ ٹھیک نہیں ہوتا، میں تمہاری مدد کرونگا۔

ملکہ :- نہیں، جہاں پناہ، آپ کیوں تکلیف کریں۔ کچھ عرصے کے لیے ایک خادمہ رکھ لیجیے۔ میرا ہاتھ ٹھیک ہو جائے تو پھر سارا کام کاج میں خود ہی کر لیا کروں گی۔

سلطان :- ملکہ! تم بھی جان بوجھ کر انجان بنتی ہو۔ میری اتنی آمدنی کہاں جو خادمہ رکھ سکوں۔ حکومت کے کام اوّل تو فرصت ہی کم دیتے ہیں، چھ ماہ میں مشکل سے ایک کلام پاک کی کتابت کر پاتا ہوں۔ اس ہدیے سے بہ مشکل گھر کا خرچ چلتا ہے۔ خادمہ کے لیے کہاں سے گنجائش نکالوں؟

ملکہ :- آپ سلطان ہیں۔ شاہی خزانہ آپ کے قبضے میں ہے۔ اگر آپ اپنی واجبی ضرورت کے لیے کچھ رقم لے لیا کریں تو کیا ہرج ہے؟

سلطان :- ملکہ! شاہی خزانہ تو رعایا کی امانت ہے۔ اس میں مجھے تصرف کا کیا حق؟ یہ تو انہیں کی فلاح و بہبود پر خرچ ہونا چاہیے۔ میں تو صرف امین ہوں۔"

(سلطان کا جواب سن کر ملکہ خاموش ہو جاتی ہے۔ پھر سلطان اسے صبر و شکر کی تلقین کرتا ہے۔ ملکہ مطمئن ہو کر واپس جاتی اور گھر کے کام کاج میں لگ جاتی ہے۔ سلطان بھی اس کا ہاتھ بٹاتا ہے)

یہ تھا ہندوستان کے ایک نامور بادشاہ سلطان ناصر الدین کے گھر کا نقشہ، جس کا بیس سالہ دورِ حکومت ہندوستان کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ یہ اپنے باپ التمش کی وفات کے بعد سنہ ۱۲۴۶ء میں دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے شاہی میں بھی فقیری کی۔ نہ اس نے حکومت کی خواہش کی تھی اور نہ ہی بادشاہ ہو کر دوسرے سلاطین کی طرح اس نے اپنے منصب سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ تقویٰ، عبادت گذاری، سادگی اور خوش اخلاقی میں یہ اپنے باپ سے بھی بازی لے گیا تھا۔ ان اوصاف حمیدہ میں عالمگیر کے سوا ہندوستان کا کوئی بھی فرماں روا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

مشہور ہے کہ ایک بار کوئی امیر اس سے ملنے آیا سلطان نے اسے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک کتاب دکھلائی۔ امیر نے اس میں کچھ غلطیاں نکالیں اور کہا کہ انہیں درست کر لیجیے گا۔ سلطان نے اس کے کہنے پر ان الفاظ کے گرد حلقے بنا دیے مگر جب وہ امیر چلا گیا تو وہ حلقے مٹا دیے۔ مصاحبوں میں سے کسی نے حلقوں کے مٹانے کا سبب دریافت کیا، تو سلطان بولا:۔

"دراصل یہ غلطیاں نہ تھیں۔ میرے دوست کو خود غلط فہمی ہوئی۔ چونکہ ایک خیر خواہ کا دِل دُکھانا مجھے پسند نہ تھا اس لیے ان کے کہنے پر میں نے الفاظ کے گرد حلقے بنا لیے تھے' اب انہیں مٹا دیا۔"

یہ تھا سلطان کی خوش اخلاقی کا حال۔ آنحضرتؐ کا اتنا احترام ملحوظ رکھتا تھا کہ بلا وضو نام لینا بھی بے ادبی سمجھتا تھا۔ ایک بار اپنے ایک درباری کو جس کا نام محمد تھا، تاج الدین کہہ کر پکارا۔ درباری سمجھا شاید سلطان مجھ سے خفا ہیں۔ اس لیے ڈر کے مارے کئی دن دربار نہ آیا۔ سلطان کو معلوم ہوا تو قسم کھا کر اسے یقین دلایا کہ:۔

"میں تم سے مطلق رنجیدہ نہیں ہوں۔ اس دن تمہارا نام نہ لینے کی وجہ یہ تھی کہ میں باوضو نہ تھا اور بغیر طہارت کامل کے لفظ "محمدؐ" میں اپنی زبان سے ادا نہ کر سکتا تھا۔"

التمش کے مرنے پر اس کے بیٹوں، بیٹی، پوتوں اور دوسرے دعویداروں میں تخت و تاج کے لیے کافی کشمکش رہی۔ دس سال کی قلیل مدت میں متعدد جانیں ضائع ہوئیں، کئی دعوے دار قتل اور کئی محبوس ہوئے۔ ناصر الدین طبعًا نیک تھا۔ حکومت کی ذمہ داریوں کا پورا احساس رکھتا تھا۔ چنانچہ ان ہنگاموں سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ پھر بھی خود غرضوں کے بے جا انتقام کا شکار رہنا اور بلاوجہ قید کر دیا گیا۔ جیل کا زمانہ بھی اس نے نہایت صبر و استقلال سے گذارا۔ اس معذوری

ہیں بھی نہ تو اپنی معاش کے لیے اس نے کسی کا احسان لینا گوارا کیا اور نہ اپنا وقت ہی ضائع ہونے دیا بلکہ اس تنہائی اور یک سوئی سے فائدہ اٹھا کر اس نے اپنی علمی لیاقت بڑھائی اور خوش نویسی سیکھ لی۔ اس کے بعد کتابیں لکھ کر گذر اوقات کرنے لگا۔

التمش کے نااہل جانشینوں کے طرزِ عمل سے عاجز آ کر امرائے سلطنت نے ناصر الدین کو اپنا سلطان منتخب کیا اور دہلی کے تخت پر لا بیٹھایا۔ رعایا بھی ایسے پرہیزگار اور خدا ترس بادشاہ کے انتخاب سے خوش ہوئی۔ اللہ نے بھی اس کے تقوے کی لاج رکھی۔ اس پر اپنا فضل کیا اور حکومت کے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بلبنؔ جیسا مدبر اور فرض شناس وزیر عطا فرمایا جس نے حسنِ انتظام سے اندرونی خلفشار کو دور کیا، مفسدوں اور باغیوں کا زور توڑا اور بیرونی حملہ آوروں کی لوٹ مار سے رعایا کو نجات دلائی۔

بلبن دراصل التمش کے ان چالیس زر خرید غلاموں میں سے ایک تھا جو امرائے چہلگان یا "خوانین شمسہ" کے نام سے مشہور تھے۔ ابتدا میں اس کے سپرد شاہی مطبخ کی سقہ گیری ہوئی تھی مگر اپنی فرض شناسی، وفا شعاری اور صلاحیتوں کے باعث ترقی کرتے کرتے وہ ناصر الدین کا وزیر اور اس کی وفات پر دہلی کے تخت و تاج کا مالک بن گیا۔ ناصر الدین کی اہلیہ سلیمہ اسی کی بیٹی تھی جو ملکہ ہونے پر بھی سارا کام کاج اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی تھی۔

سلطنت کے بنانے بگاڑنے میں "خوانین شمسہ" کو کافی دخل تھا۔ التمش کی وفات کے بعد ملک میں جو دس سال تک انتشار اور افراتفری پھیلی رہی، اس کی بڑی وجہ دراصل انہیں خوانین کی شرارتیں اور سازشیں تھیں۔ ناصر الدین کی تخت نشینی کے بعد بھی اس کی نرم مزاجی سے فائدہ اٹھا کر یہ لوگ انتشار پھیلانا چاہتے

تھے، مگر بلبن ان کی حرکات و سکنات سے خوب واقف تھا۔ چنانچہ ان کی ایک پیش نہ گئی اور رفتہ رفتہ اس نے سب کو مغلوب کر لیا۔

انتشار کے دور میں: پنجاب، قنوج، میوات، رنتھمبور، گوالیار، چندیری، مالوہ وغیرہ کے مفسدوں اور باغیوں نے سر اٹھایا تھا۔ ان میں سے اکثر مقامات کے مفسدوں نے ناصر الدین کے تخت نشین ہونے کے بعد بھی بغاوت جاری رکھی۔ بلبن نے ایک ایک کر کے انہیں بھی ختم کیا اور چند ہی دنوں میں اندرونِ ملک کا سارا خلفشار ختم ہو گیا۔

اسی دور کا ایک بہت بڑا فتنہ مغلوں کی غارت گری بھی تھی۔ ناصر الدین کی تخت نشینی سے قبل پنجاب میں ان لوگوں نے کافی لوٹ مار کی تھی اور وہاں کے پہاڑی قبائل نے ان لٹیروں کا ساتھ دیا تھا۔ ناصر الدین کے زمانے میں غارت گر مغل سردار ہلاکو خاں نے دہلی میں اپنے سفیر بھیجے۔ بلبن نے ان کی باریابی کے وقت نہایت شان و شوکت اور رعب داب کا مظاہرہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغل سفیر بے حد مرعوب ہوئے اور ایک عرصے تک کے لیے ملک مغلوں کی غارت گری سے محفوظ ہو گیا۔

ناصر الدین پورے بیس سال حکومت کر کے ۱۲۶۶ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اس کی وفات کے بعد اس کا وزیر بلبن جو رشتے میں خسر بھی تھا، دہلی کے تخت و تاج کا مالک ہوا۔ حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی اس میں بہت ہی غیر معمولی تبدیلی ہوئی۔ اب وہ ایک مدبر فرماں روا کے ساتھ ہی ساتھ عابدِ شب بے دار بھی تھا۔ امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام نیز ملکی انتظام کے ضمن میں اس نے ایسا زبردست نمونہ پیش کیا ہے کہ تاریخ ہند میں یادگار رہے گا۔ وہ بہت ہی مردم شناس تھا۔

کبھی کوئی ذمے داری کی جگہ کسی نا اہل کو نہیں دیتا تھا۔ انتخاب میں کافی احتیاط کے باوجود عمّال حکومت کی سخت نگرانی کرتا اور رعایا کی شکایات پر انہیں سخت سزائیں دیتا تھا۔

ایک بار بدایوں کے گورنر نے ایک فرّاش کو اتنا پٹوایا کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ فرّاش کی بیوی نے شکایت کی۔ جرم ثابت ہونے پر بلبن نے اس عورت کے سامنے گورنر کے اتنے دُرّے لگوائے کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ ساتھ ہی وہاں کے جاسوس کو بھی سولی پر اس جُرم میں لٹکا دیا گیا کہ اس نے اس واقعے کی اطلاع سلطان کو نہیں دی تھی۔

ظاہر ہے کہ ایسے فرماں روا کے دور میں حکّام رعایا کو ستانے کی جرارت کس طرح کر سکتے تھے۔

سلطان بلبن نے بھی بیس سال تک نہایت شاندار طریقے سے حکومت کی اور ۱۲۸۶ء میں انتقال کر گیا۔

بلبن کے جانشین

بلبن کے دو بیٹے تھے، شہزادہ محمد، اور بغرا خاں۔ شہزادہ محمد اپنے اوصاف حمیدہ، شجاعت اور انتظامی صلاحیت کے باعث سلطان کو بہت محبوب تھا۔ اس کے اعلیٰ اخلاق اور علم دوستی کی شعراء نے بے حد تعریف کی ہے۔ دہلی کے مشہور شاعر اور صوفی امیر خسرو، جن کی طرف متعدد پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں منسوب کی جاتی ہیں، اسی صاحبزادے کے مصاحب تھے۔ بلبن نے شہزادہ محمد کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا تھا۔ لائق بیٹے نے بارہ تیرہ سال تک بیرونی حملہ آوروں کا پامردی سے مقابلہ کر کے سرحدوں کی حفاظت کی۔ مغل حملہ آور بار بار آگے بڑھتے، مگر اس کی دلیری کے آگے ایک پیش نہ جاتی اور ہمیشہ پسپا ہوتے۔ ایک بار انہیں سے قوت آزمائی میں اس بے چارے کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا اور امیر خسروؒ بھی مغلوں کے قیدی بن کر دو سال بلخ میں نظر بند رہے۔ شہزادہ محمد کا جاں بحق ہونا ایک ایسا زبردست سانحہ تھا جس کا چھوٹے بڑے سب کو انتہائی

قلق رہا۔ سلطان نہایت غمگین رہنے لگا۔ جب کبھی بیٹے کی یاد آتی تو وہ زارو قطار رونے لگتا۔ فرطِ غم سے رفتہ رفتہ اس کی صحت گرنے لگی۔ اس نے اپنے بیٹے بغرا خاں کو جو بنگال کا گورنر تھا، دہلی بلا لیا، مگر جب سلطان کی طبیعت ذرا سنبھلنے لگی تو چند دن قیام کر کے وہ بنگال لوٹ گیا۔

اسی اثنا میں بلبن چل بسا۔ بغرا خاں کا بیٹا کیقباد سترہ اٹھارہ سال کا صالح نوجوان تھا۔ امراء نے اسی کو تخت پر بٹھا دیا۔ بلبن نے اپنی نگرانی میں کیقباد کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کیا تھا۔ چنانچہ لوگ اس سے بہت پُرامید تھے، مگر تخت نشین ہونے کے بعد نااہل مصاحبوں کی صحبت نے اسے ایسا بگاڑا کہ اس کا وقار بھی جاتا رہا اور صحت بھی برباد ہو گئی۔ سلطنت کے کاروبار سے اسے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ ہر وقت ناچ رنگ اور شراب کباب میں مست رہنے لگا۔ اس کے باپ بغرا خاں کو اس کی بے ہودہ حرکات کا علم ہوا تو اس نے مل کر انجام بد سے ڈرایا اور کافی تنبیہہ کی۔ باپ کے سمجھانے بجھانے کا تھوڑے دنوں اثر رہا مگر پھر توبہ توڑ دی اور داد عیش دینے لگا، مگر تابکے۔ بدکاری اور کثرتِ شراب نوشی کے باعث اس پر فالج گرا اور وہ بسترِ مرگ پر موت کی گھڑیاں گننے لگا۔ ترک امراء نے بادشاہ کی بے چارگی دیکھی تو اسے نظر بند کر کے اس کے شیر خوار بچے کو تخت نشین کر دیا۔ نااہلوں کے ہاتھ میں باگ ڈور آجانے کے باعث سلطنت کا انتظام درہم برہم ہو گیا۔

جلال الدین خلجی شہزادہ محمدؒ کے بعد پنجاب کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔ یہ نہایت آزمودہ کار سپہ سالار تھا۔ اس نے جب یہ حالت دیکھی تو اپنی فوج لے کر آگے بڑھا اور تخت دہلی پر قابض ہو گیا۔ کیقباد کو کسی نے بیماری اور کس مپرسی کی حالت میں قتل کر دیا۔

جلال الدین خلجی نے کوئی چھ سال حکومت کی ہو گی کہ اس کے بھتیجے اور داماد علاء الدین خلجی نے اسے روزے کی حالت میں قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔

۱۔ ناصر الدین کون تھا؟ اس کے اخلاق و عادات کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟

۲۔ خادمہ کے متعلق اہلیہ سے اس کی کیا بات چیت ہوئی؟

۳۔ اپنی گذر اوقات یہ کس طرح کرتا تھا؟

۴۔ بلبن کون تھا؟ اس نے کیا خدمات انجام دیں؟

۵۔ شہزادہ محمد کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ بلبن کا جانشین کون بنا؟ وہ کیسا آدمی تھا؟

باب ۱۹

علاؤالدین خلجی اور قاضی مغیث الدین

اپنے شفیق چچا اور بوڑھے خسر کو قتل کر کے تخت و تاج حاصل کرنے والے محسن کش، سنگ دل، ضدی، دولت کے حریص، ملک گیری کے دل دادہ، ظالم، بدکردار، جاہل، مذہب کے معاملے میں اکبر کی طرح خبطی اور ایک نیا دین گھڑنے کے خواہش مند سلطان علاؤالدین خلجی نے ایک بار بیانہ کے قاضی مغیث الدین سے چند شرعی امور پر گفتگو کی۔ ان دونوں کا مکالمہ درج ذیل ہے۔

سلطان: قاضی صاحب! میں آپ سے چند مسائل دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

قاضی: (بھرائی ہوئی آواز میں) معلوم ہوتا ہے میرا آخری وقت آگیا ہے۔ آپ مسئلہ پوچھنے کی زحمت کیوں گوارا فرمائیں۔ کسی کو حکم ہو جائے کہ میرا سر قلم کر دے کیونکہ اگر میں ٹھیک جواب دوں تو ممکن ہے آپ کی مرضی کے خلاف پڑے اور میری ہلاکت کا موجب بنے، اور اگر آپ کی رعایت سے غلط بتاؤں تو تحقیق کے بعد آپ دروغ بیانی کے جرم میں مجھے قتل کرا دیں گے بہر حال نتیجہ دونوں صورتوں میں ہلاکت ہی نظر آتا ہے۔

سلطان: (مسکراتے ہوئے) آپ شریعت کے مطابق جواب دیجیے، یقین

کیجیے، آپ کو سچ کے باعث کوئی گزند نہ پہنچے گی۔
"بتائیے، شریعت کی رو سے کس غیر مسلم کو ذمی یا خراج گذار کہہ سکتے ہیں؟"

قاضی:۔ شریعت نے ان غیر مسلموں کو ذمی قرار دیا ہے جو مسلم فرمانروا کے طلب کرنے پر بلا عذر خراج یا جزیہ ادا کریں۔"

سلطان:۔ رشوت خور، بد دیانت، خائن یا غبن کرنے والے سرکاری ملازم کو کیا چوری کی سزا دی جاسکتی ہے؟

قاضی:۔ نہیں، ہاتھ تو نہیں کاٹے جاسکتے البتہ اس سے نرم سزائیں دی جاسکتی ہیں مثلاً بید لگانا، قید و بند وغیرہ۔

سلطان:۔ اچھا یہ تو بتائیے، تخت نشین ہونے سے قبل جو مال غنیمت مجھے دیوگری سے حاصل ہوا تھا اس کا مالک میں ہوں یا وہ بیت المال کی ملکیت ہے؟

قاضی:۔ جو مال بھی مسلمانوں کی فوجی قوت سے حاصل کیا جائے وہ بیت المال کی ملکیت ہے، آپ اس کے تنہا مالک نہیں ہوسکتے۔ اس میں آپ کا حق صرف اتنا ہے جتنا ایک عام سپاہی کا۔"

قاضی صاحب کے اس جواب پر سلطان نے خفگی کا اظہار کیا لیکن ان کی حق گوئی سے صحیح بات واضح ہوگئی۔

سلطان:۔ بیت المال سے مجھے اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے کتنا لینا چاہیے؟

قاضی:۔ خلفائے راشدین کا اتباع مقصود ہو تو صرف اتنا لینا چاہیے جتنا عام مسلمانوں کو ملتا ہے۔ اگر میانہ روی اختیار کرنا چاہتے ہوں تو اُمرائے سلطنت کے برابر لے سکتے ہیں۔ البتہ اگر ضعیف روایتوں کا سہارا لیں تو امرا سے کچھ زیادہ لے سکتے ہیں لیکن یہ جو لاکھوں کروڑوں کی رقم حرم پر خرچ کی جاتی ہے، قیامت کے دن اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔

سلطان:۔ (انتہائی برہم ہوکر) اچھا ان سزاؤں کے بارے میں کیا حکم ہے جو میں باغیوں، شرابیوں اور زانیوں وغیرہ کو دیا کرتا ہوں۔

قاضی:۔ (سر ہتھیلی پر رکھ کر) وہ سب احکام شریعت کے خلاف ہیں۔

سلطان اس جواب پر طیش میں بھرا ہوا حرم کے اندر چلا گیا۔ قاضی صاحب بھی اپنی زندگی سے مایوس بال بچوں سے رخصت ہونے گھر آئے۔ دوسرے دن سلطان نے پھر طلب کیا، تو سر پر کفن باندھے دربار میں حاضر ہوئے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ بادشاہ ضرور قتل کرادے گا۔ مگر پہنچے تو وہاں نقشہ ہی دوسرا تھا سلطان نہایت تپاک سے ملا اور حق گوئی کی پوری داد دی۔

اسی طرح گجرات، رنتھمبور، چتوڑ وغیرہ کو فتح کر چکنے کے بعد جب اس کی خودسری بہت بڑھی اور سکندر ثانی بننے کی فکر میں وہ ہندوستان کے باہر فارس، عرب، روم وغیرہ پر حملہ کرنے کا خواب دیکھنے لگا اور ساتھ ہی اکبر کی طرح ایک نیا دین اور نئی شریعت گڑھنے کا سودا بھی اس کے سر میں سمایا تو دہلی کے کوتوال علاء الملک نے ان حرکات سے باز رکھنے کی لیے جس بے باکی سے گفتگو کی ہے وہ قابل داد ہے۔

علاء الملک نے کہا:۔

"دین و شریعت کا تعلق انبیا علیہم السلام سے ہے۔ وحی آسمانی ان کی رہ نمائی کرتی رہی ہے۔ نبوّت و رسالت آنحضرتؐ پر ختم ہو چکی، اب اگر آپ نیا مذہب ایجاد کریں گے تو خاص و عام سب آپ سے متنفر ہو جائیں گے اور سلطنت میں فسادِ عظیم پیدا ہوگا۔ چنگیز و ہلاکو وغیرہ نے دینِ محمدی کو مٹانے کی پوری کوشش کی لیکن وہ ایسا نہ کر سکے بلکہ آخر میں اسی دین کو خود قبول کیا" علاء الدین ان کی بے باکی سے کافی متاثر ہوا اور نیا دین گھڑنے کا خیال ترک کر دیا۔ دہلی کے مشہور بزرگ نظام الدین اولیاؒ اس وقت زندہ تھے، سنا تو علاء الملک کو بہت

دعائیں دیں۔

پھر علاؤ الملک نے ہندوستان ہی کے بعض غیر مقبوضہ علاقوں کی طرف توجّہ دلا کر دنیا کو فتح کرنے کا منصوبہ بھی فسخ کرا دیا۔

یہ ساری حرکات دراصل علاؤ الدین کی جہالت اور شرعی امور سے عدم واقفیت کے باعث تھیں، ورنہ اللہ نے اسے غیر معمولی جرأت، اُپج اور انتظامی صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ اس نے جس مہم میں بھی ہاتھ ڈالا کامیاب رہا۔ مغل حملہ آوروں کے دانت کھٹے کر دیے۔ اپنے بیس سالہ دورِ حکومت میں ملک کو فتنہ وفساد، چوری، ڈاکہ، رشوت ستانی اور غبن وغیرہ سے بہت حد تک پاک رکھا۔ حکام کی نگرانی کے لیے جاسوس مقرر کیے، ان کی غلطیوں پر سخت سزائیں دے کر رعایا کو ان کی ایذا رسانی سے محفوظ رکھا، ہر قسم کی اشیاء کے نرخ مقرر کر دیے اور اس پر عمل درآمد کرانے کے لیے ایک محکمہ قائم کیا۔ اس طرح اپنی کوششوں سے ملک کا انتظام بگڑنے نہیں دیا اور ہندوستان کا بیشتر حصّہ فتح کر کے اپنی مملکت بہت وسیع کر لی، البتہ اس کے آخری دو تین سال بہت ہی خراب گزرے۔ کثرتِ کار نے اس کی صحت بگاڑ دی، وہ آئے دن بیمار رہنے لگا، جگہ جگہ باغیوں نے سر اٹھانا شروع کیا، بغاوت کی پریشان کن خبریں سُن سُن کر وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا۔ مزاج میں بے حد چڑچڑا پن آ گیا، بدمزاجی بہت بڑھ گئی۔ بیوی بچّے اس کی صورت سے گھبرانے لگے۔ چنانچہ معقول تیمارداری نہ ہو سکی اور وہ بے یار و مددگار ۱۳۱۶ء میں مہلت کی مدّت ختم کر کے یہاں سے کوچ کر گیا۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کے چہیتے غلام ملک کافور نے جو ابتدا میں اس کا سپہ سالار اور بعد میں وزیرِ اعظم بن گیا تھا اسے زہر دے دیا تھا۔

علاؤ الدین کے جانشین اس کی وفات کے بعد اس کے خاندان کا نہایت

عبرت ناک انجام ہوا۔ تین چار سال تک ملک میں بہت ہی افراتفری پھیلی رہی۔ ملک کافور نے جو پہلے ہی اس کا وزیر اعظم بن چکا تھا، حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے ایک چھ سالہ شہزادے کو تخت پر بٹھا دیا اور منتظم امراء نیز دوسرے شہزادوں کو قید و بند کی سزا دی بعض کی آنکھیں نکلوالیں۔ ملکہ کا سارا اثاثہ ضبط کر کے نظر بند کرا دیا۔ لوگ اس کی شرارتوں سے تنگ آ گئے تھے چنانچہ ایک ہی ماہ میں اسے قتل کر کے امراء نے علاؤ الدین کے بیٹے مبارک شاہ کو اس کی جگہ مقرر کر دیا۔ اس نے چند دن تو اپنے خورد سال بھائی کے نائب کی حیثیت سے کام کیا پھر اُسے گوالیار میں نظر بند کر کے خود تخت و تاج کا مالک بن گیا اور اپنے ایک نو مسلم غلام خسرو خاں کو اپنا وزیر اعظم بنا لیا۔ خسرو خاں انتہائی بد طینت، اور بے حیا تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ مبارک کو عیش و عشرت اور ناچ رنگ، شراب، کباب، اور بے حیائی و فحاشی میں مبتلا کر دیا۔ مبارک شاہ کو ہر حیثیت سے ناکارہ بنا چکنے کے بعد پہلے تو اس نے ان امراء میں سے بعض کو دہلی سے دور بھجوا دیا اور بعض کو قتل کرایا جنہیں وہ اپنی راہ کا روڑا سمجھتا تھا۔ پھر سازش کر کے گجرات کی بردار فوج کی مدد سے مبارک شاہ کا سر قلم کر کے خود تخت پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے شاہی خاندان کے ایک ایک فرد کو چُن چُن کر قتل کرایا۔ حرم سرا کی عورتوں کو بے عزت کیا۔ اس کے مظالم کا سلسلہ نہ جانے ابھی اور کب تک چلتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل فرمایا اور پنجاب کے صوبے دار غازی ملک نے حملہ کر کے خسرو خاں نمک حرام کو تہ تیغ کیا اور اس کے ظالم ساتھیوں کی بدمعاشیوں سے ملک کو نجات دلائی۔

انہیں دنوں دہلی میں ایک بزرگ بشیر دیوانہ تھے۔ علاؤ الدین کے خاندان کا عبرت ناک انجام دیکھ کر کسی نے ان سے پوچھا "حضرت یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ بولے "جو جیسا کرے گا وہ اس کے اور اس کی اولاد کے سامنے آئے گا۔ اس نے

اپنے محسن چچا جلال الدین اور اس کی اولاد کے ساتھ جو کچھ کیا یہ اسی کا پھل ہے۔ حکومت اور دولت چلتی پھرتی چھاؤں ہے سارے ممالک خدا کے ہیں، اس لیے بادشاہی اسی کو مسلّم ہے۔"

۱۔ علاؤالدین کون تھا؛ اس نے کس طرح حکومت حاصل کی؛

۲۔ دین کے معاملے میں وہ کیسا تھا؛ کیوں؛

۳۔ قاضی مغیث سے اس کی کیا گفتگو ہوئی؛ قاضی کے جوابات کا اس پر کیا اثر پڑا؛

۴۔ علاؤ الملک کون تھا؛ اس نے بادشاہ کو ایک نیا دین گھڑنے سے کیوں کر باز رکھا؛

۵۔ علاؤالدین کے آخری ایام کس طرح گذرے؛

۶۔ اس کا جانشین کون ہوا؛ وہ کیسا آدمی تھا؛

۷۔ خسرو خاں کون تھا؛ اس نے کس طرح تخت حاصل کیا؛

۸۔ خسرو خاں نے علاؤالدین کے خاندان اور دیگر امرا کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؛

۹۔ خسرو خاں کے مظالم سے ملک کو کیوں کر نجات ملی؛

باب ۲۰

تغلق شاہ اور اُس کے جانشین

خسرو خاں کے مظالم اور اس کے ساتھیوں کی چیرہ دستی سے لوگوں کو نجات دلانے کے بعد غازی ملک نے ایک اجتماع کیا، جس میں مملکت کے تمام بہی خواہ امراء اور عاملین شریک ہوئے۔ خسرو خاں نے اپنے پانچ ماہ کے دورِ استبداد و سرمستی میں خلجی خاندان کے تمام افراد کو چُن چُن کر قتل کرادیا تھا یہاں تک کہ علاؤالدین خلجی کے ایک بھانجے مسمّیٰ ملک مسرّت کو جو ترک دنیا کر کے گوشہ نشین ہوگیا تھا اسے بھی مروا ڈالا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ حکومت کی باگ ڈور کون سنبھالے۔ لوگوں کی نظرِ انتخاب غازی ملک ہی پر پڑ رہی تھی۔ چنانچہ سب نے اسی کا نام تجویز کیا مگر تخت و تاج کی ذمے داریوں کا احساس کر کے غازی ملک نے انکار کردیا اور جواب میں ایک تقریر کی، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

" حضرات! خسرو خاں کے مظالم کی داستان سُن سُن کر مجھے انتہائی کوفت ہوتی تھی میں نے تین باتوں کا عزم کرلیا تھا۔

۱۔ یہ کہ سرزمین ہند میں اسلام کو دوبارہ زندہ کروں گا۔

۲۔ اس ملک کی باگ ڈور خسرو خاں سے چھین کر کسی اہل شخص کے حوالے کروں گا۔

۳۔ جن بدبختوں اور نمک حراموں نے شاہی خاندان کو اس بے دردی سے

ہلاک کیا ہے ان کے ناپاک وجود سے اس مملکت کو پاک کروں گا۔

یہ تینوں ارادے خالصتہً لوجہ اللہ تھے اللہ کا شکر ہے، اس نے مجھے توفیق دی اور میرے ارادے پورے ہوئے آیندہ بھی میری تلوار صرف اللہ کے لیے اٹھے گی۔ میں تخت و تاج کا بھوکا نہیں، شاہی خاندان کا کوئی فرد زندہ ہو تو بہا، ورنہ بڑے بڑے امراء موجود ہی ہیں، کسی کو بادشاہ چن لیا جائے۔ میرا تخت و تاج تو میرا تیر و کمان ہے۔ مجھے میرا گھوڑا چاہیے اور دیپال پور کا ویرانہ بس یہی میرے لیے کافی ہیں۔"

غازی ملک انکار کرتا رہا مگر امراء نے اصرار کر کے تاج شاہی اس کے سر پر رکھ دیا۔ اس طرح وہ ۱۳۲۰ء میں غیاث الدین تغلق کے لقب سے سلطنتِ دہلی کا تاجدار بنا۔

غیاث الدین بہت ہی خدا ترس، صوم و صلوٰۃ کا پابند اور نہایت منتظم فرماں روا تھا۔ وہ رعایا کی فلاح و بہبود کا پورا لحاظ رکھتا۔ تخت نشینی کے بعد سب سے اہم کام ملک میں امن و امان بحال کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے اس طرف توجہ کی اور اپنے حُسنِ انتظام سے نہایت قلیل مدّت میں ملک کو اندرونی مفسدوں کے فتنہ و فساد سے پاک اور مغل حملہ آوروں کی غارت گری سے محفوظ کر لیا۔ ہر طرف عدل و انصاف کا دور دورہ ہو گیا، پیداوار بھی بڑھ گئی، اور رعایا خوش و خرم رہنے لگی۔ لیکن ابھی بہ مشکل چار سال گزرے تھے کہ اچانک چھت گر پڑی اور ملک اس زبردست حکمراں کی خدمت سے محروم ہو گیا۔

محمد تغلق

اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمد تغلق ۱۳۲۵ء میں اس کا جانشین ہوا۔ یہ عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا، بہت ہی ذہین، نہایت دور اندیش، متبحر عالم، مختلف علوم و فنون میں ماہر، مہمان نواز، سخی، خدا ترس

اور شریعت کا پابند ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مقرّر، مضمون نگار، خوشنویس اور شاعر بھی تھا۔ یتیموں اور بیواؤں کی خبر گیری، محتاجوں اور بےکسوں کی امداد اور مظلوموں کی پشت پناہی کرتا۔ وہ دھن کا پکا اور بات کا دھنی تھا۔ بہت ہی سوچ سمجھ کر فیصلے کرتا اور جس بات کا تہیہ کر لیتا اسے تکمیل تک پہنچاتا، خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

عدل وانصاف کا تو اُس نے ایسا زبردست نمونہ پیش کیا ہے کہ تاریخ ہند میں اس کی مثالیں کم ہی ملیں گی۔ حکومت کے بڑے سے بڑے عہدیدار یہاں تک کہ خود سلطان کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کی عام اجازت تھی۔ چنانچہ ایک بار ایک غیر مسلم نے دعویٰ کیا کہ سلطان نے اس کے بھائی کو بلا وجہ قتل کرا دیا ہے۔ سلطان بھی عام ملزموں کی طرح عدالت میں حاضر ہوا۔ قاضی نے فیصلہ کیا کہ سلطان پر جُرم ثابت ہے مقتول کے ورثا ر کو یا تو سلطان خوں بہا دے کر راضی کرے ورنہ قصاص لیا جائے گا۔ سلطان نے خوں بہا دے کر ورثہ کو راضی کر لیا جب جا کر جان چھوٹی۔

عرب سیّاح ابن بطوطہ اسی کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا۔ وہ دہلی اور اس کے گرد و نواح میں کوئی آٹھ سال مقیم رہا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں آنکھوں دیکھا ایک واقعہ لکھا ہے جو نہایت عجیب وغریب ہے۔ لکھتا ہے کہ ایک بار سلطان کہیں گشت کرنے جا رہا تھا، راستے میں دیکھا ایک غریب کا بچّہ کھڑا رو رہا ہے اور ایک امیر کا بچّہ اسے بُرا بھلا کہہ رہا ہے۔ سلطان سمجھا کہ امیر بچّے نے غریب بچّے کو مارا ہوگا، حالانکہ مارا تھا غریب بچّے نے اور خود ہی اس ڈر سے رونے لگا تھا کہ مبادا پیٹ نہ جائے۔ سلطان نے غلط فہمی میں امیر بچّے کو کئی بید رسید کر دیے۔ اس نے سلطان کے خلاف عدالت میں دعویٰ کر دیا۔ عدالت نے سلطان کے

خلاف فیصلہ کیا۔ چنانچہ سلطان نے لڑکے کو دربار میں بلا کر اس کے ہاتھ میں چھڑی دی اور بدلہ چکانے کے لیے کہا۔ لڑکا پہلے گھبرایا، مگر جب قسم دلائی تو وہ تیار ہو گیا اور دربار عام میں سلطان کو اکیس چھڑیاں لگائیں۔ ایک چھڑی تو ایسی پڑی کہ اس کا تاج نیچے آ رہا۔

سلطان کی طرف سے عام اعلان تھا کہ کسی کو جو شکایت ہو وہ بلا تکلف سلطان تک پہنچائے اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ عام دادرسی کے لیے اس نے ہفتے کے دو دن مخصوص کر دیے تھے۔ وہ اپنے چار معتمد آدمیوں کے ساتھ پابندی سے ہر پیر اور جمعرات کو ایک میدان میں بیٹھ جاتا، لوگ آتے اور اپنی شکایات درج کرا دیتے، پھر وہ ایک ایک کر کے دیکھتا اور سب کے ساتھ انصاف کرتا۔ سلطان بہت ہی جفاکش اور سادہ مزاج آدمی تھا۔ وہ اپنے عیش و آرام پر رعایا کا ایک پیسہ بھی ضائع کرنا گناہ سمجھتا، مگر اس کی فیاضی کا یہ عالم تھا کہ بخشش و عنایات میں کبھی کبھی پورا خزانہ خالی ہو جاتا۔

نماز دین کا سب سے اہم ستون ہے یہی انسان کو اطاعتِ الٰہی پر اُبھارتی اور فواحش و منکرات سے باز رکھتی ہے۔ سلطان اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا۔ چنانچہ خود نہایت سختی سے پابندی کرتا اور اپنی مملکت کے تمام مسلمانوں کو نماز باجماعت کا حکم دیتا۔ اس نے متعدد افراد اس کام پر متعین کیے تھے کہ جو لوگ نماز باجماعت ادا نہ کریں، یا نماز کے وقت بازار میں گھومتے ملیں انہیں سزا دی جائے یا پکڑ کر سلطان کے پاس لایا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیر غریب پڑھے ان پڑھ سب صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو گئے۔

اسے دین کی اشاعت کا بھی بہت خیال تھا۔ اس کے دور تک شمالی ہند تو

کسی حد تک اسلام کی روشنی سے منور ہو چکا تھا مگر جنوبی ہند میں اسلام کی روشنی سواحل سے آگے نہیں بڑھی تھی، کیونکہ اس وقت تک وہاں مسلمانوں کے پاؤں جمنے کی کوئی صورت نہیں نکلی تھی۔ دہلی کے سلاطین میں سے بعض نے دکن کے راجاؤں کو اپنا باج گذار بنانے کی کوشش کی تھی، مگر ان کی کوششیں کچھ زیادہ بار آور نہیں ہوئی تھیں کیوں کہ دار السلطنت سے دوری کے باعث وہ لوگ بہت جلد خود مختار ہو جایا کرتے تھے۔ سلطان نے محسوس کر لیا تھا کہ جب تک جنوبی ہند ہی کے کسی مقام کو دار السلطنت نہ بنایا جائے گا وہاں تسلط برقرار رکھنا ناممکن ہوگا۔ چنانچہ اس نے دیوگری کو دار السلطنت بنایا اور دہلی کی مسلمان رعایا خصوصًا علماء اور صوفیاء کو دہلی چھوڑ کر وہاں آباد ہونے کا حکم دیا۔ بعض تن آسان لوگوں کو جو دہلی کی گلیوں کو کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے سلطان کا یہ حکم بہت کھلا مگر اس کے اس اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکھن میں مسلمانوں کے قدم جم گئے اور کام کرنے والوں کو دین کی اشاعت کا موقع ہاتھ آ گیا۔

آج کل کی حکومتوں کی طرح وہ دین دنیا کی تفریق کا قائل نہ تھا بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح حکومت کا سارا کام بھی اللہ کی مرضی کے مطابق چلانا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ خلیفۂ وقت سے جب تک اجازت نہ مل جائے مجھے ہند میں حکومت کا حق نہیں پہنچتا۔ اس سے پہلے بھی دہلی کے تمام سلاطین اپنے کو خلیفۂ وقت کا نائب کہتے اور سکوں نیز خطبوں میں خلیفہ کا نام مقدم رکھتے مگر یہ تعلق برائے نام ہی ہوتا۔ محمد تغلق اپنے کو صحیح معنی میں خلیفہ کا نائب بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ عباسی خلیفہ سے جو اس وقت مصر میں مقیم تھا، اس نے ہندوستان میں حکومت کی اجازت حاصل کی۔ خلیفہ کے نمائندے جب سند لے کر آئے تو اس نے بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ خلیفہ کے لیے سب سے بیعت لی، اور اپنے

بجائے خلیفہ کے نام کے سکے جاری کیے۔

دنیادار علماء اور بگڑے ہوئے صوفیاء کی وجہ سے مسلمانوں میں طرح طرح کی بدعتیں اور بُری بُری رسمیں رائج ہوگئی تھیں، سلطان نے اصلاح حال کی کوشش کی۔ اس پر بگڑے ہوئے لوگوں کی طرف سے کافی مزاحمتیں ہوئیں، اکثر ضد میں سلطان کے باغیوں سے مل گئے اور اسے کافی پریشان کیا، مگر وہ دُھن کا پکا تھا، باز نہ آیا، اور اسی قسم کی ایک بغاوت فرو کرنے وہ گجرات گیا تھا کہ اچانک شدید بخار میں مبتلا ہو کر ۱۳۵۱ء میں فوت ہو گیا۔

فیروز تغلق

محمد تغلق کا ستائیس سالہ دورِ حکومت مسلسل کشمکش کا دور تھا۔ اس کی وفات کے بعد فیروز تغلق تخت نشین ہوا۔ یہ سلطان کا چچازاد بھائی تھا۔ سات سال کی عمر میں یتیم ہو گیا تھا۔ محمد تغلق نے اسے اپنی اولاد کی طرح پالا پوسا اور تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا تھا۔ فیروز بھی نہایت خدا ترس اور پرہیزگار شخص تھا۔ اس کے محاسن کے باعث مرتے وقت سلطان نے اسی کو جانشین بنانے کی وصیت کی تھی۔ مگر جب علماء اور امراء نے تاج شاہی پیش کیا تو فیروز نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "میں حج کا ارادہ کر چکا ہوں، لہٰذا کسی اور کو بادشاہ بنالیا جائے" لیکن اس سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا شخص نہ تھا۔ اس لیے لوگوں نے اسی کو بادشاہ بننے پر مجبور کیا۔ فیروز نے اڑتیس سال حکومت کی۔ اس کے دورِ حکومت کو تمام مورخین سراہتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اسے رعایا کی فلاح و بہبود کا بے حد خیال تھا۔ اس نے رفاہِ عامہ کے متعدد کام کیے۔ کنوئیں کھدوائے، نہریں جاری کرائیں، باغ لگوائے، سڑکیں اور پُل بنوائے، مدارس، خانقاہیں اور شفاخانے قائم کیے۔ وہ شریعت کا بہت پابند اور اسلام کی اشاعت کا دل سے خواہاں تھا۔ وہ تمام امور میں علماء سے مشورہ کرتا، انہیں کے فتوے پر اس نے

اپنی مملکت کے تمام غیر مسلموں کو ذمّی قرار دے کر ان کے جان، مال، عزت، آبرو کی ذمّہ داری اپنے سر لے لی اور ان کے تمام حقوق سے انہیں نوازا، جو اسلام نے ذمیوں کو دیے ہیں۔ اس نے جزیے کے علاوہ دوسرے تمام ٹیکس معاف کر دیے۔ اپنے انہیں احسانات اور رفاہی کاموں کے باعث سلطان اپنی زندگی میں بھی ہر دلعزیز رہا اور اب تک تمام لوگ اس کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ وہ اڑتیس سال حکومت کر کے ۱۳۸۸ء میں انتقال کر گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ